منشور

مجیب خیرآبادی

میرا جنوں شرمسار، دیکھیے کب تک رہے
فصلِ خزاں پر بہار، دیکھیے کب تک رہے

دیکھیے کب تک بہے، دیدہ و دل سے لہو؟
صحنِ چمن لالہ زار، دیکھیے کب تک رہے

دیکھیے کب تک رہے کج کلہِ شہریار؟
بر دوشِ تاجدار، دیکھیے کب تک رہے

آج بھی ہے کو بکو، بستہ بپا دام و دد!
عشق غریب الدیار، دیکھیے کب تک رہے

دستِ ستم کٹ نہ جائے لوح و قلم چھین کے
عظمتِ فن یادگار، دیکھیے کب تک رہے؟

قیمت ۲۵ پیسے

اپریل ۶۵ء

حیات و کائنات کا ترجمان

منشور

جلد ۲ اپریل ۱۹۶۵ء شمارہ ۴

مدیر
سبطِ اختر

قیمت فی پرچہ
پچیس پیسے

سال بھر کے لئے
تین روپے

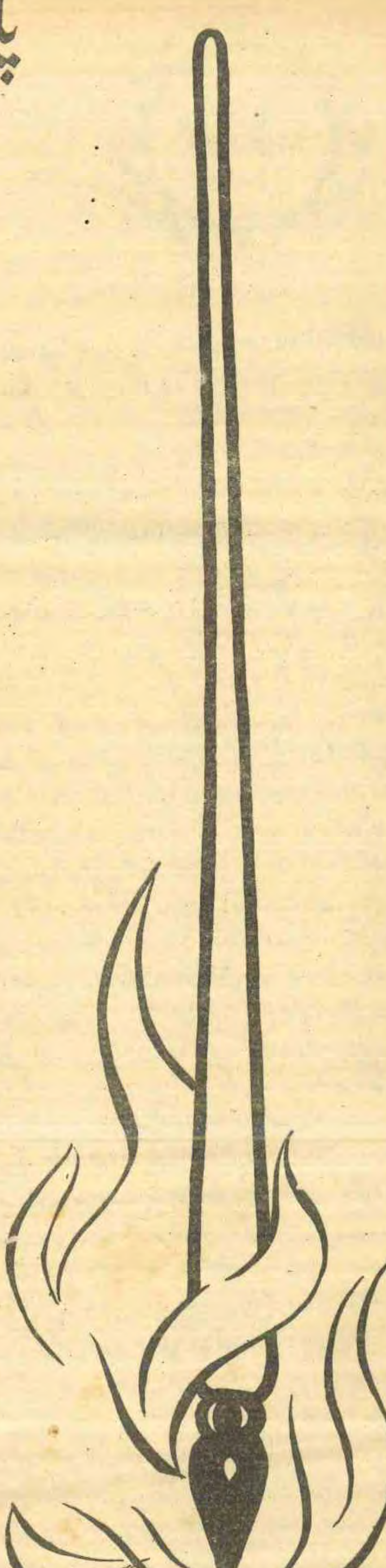
ناشر
سبط اختر

مطبع
مشہور پریس میکلوڈ روڈ کراچی

پتہ
ماہنامہ منشور۔ ایرویز ایمپلائز یونین۔
پی آئی اے برانچ۔ کراچی ایرپورٹ
فون نمبر ۴۹۱۶۹

اِس منشور میں

پاک چین دوستی ــــ ایک قدم آگے



فروری ۱۹۶۴ء میں عوامی جمہوریہ چین کے وزیراعظم چو این لائی کے دورۂ پاکستان کے موقع پر جاری کئے جانے والے مشترکہ اعلامیہ کو ہم نے "ایک اہم دستاویز" قرار دیا تھا اور اس کے دوررس نتائج کی پیشینگوئی کی تھی۔

صدر ایوب کا دورۂ چین اور اس کے نتائج ہماری اس سوچ کی صداقت کے آئینہ دار ہیں۔

چین میں "پاکستان" کے سربراہ کا جوش وخروش سے بھرپور جو تاریخی اور مثالی استقبال کیا گیا وہ پاکستان کے عوام سے چینی عوام کے گہرے جذبۂ دوستی اور پائیدار خلوص کا مظہر ہے۔

اس دورے میں صدر ایوب نے ــــ اس ملک ــــ چین ــــ کے ان جیالے اور باشعور عوام کو بچشم خود دیکھا جنھوں نے پاکستان کے آزاد ہونے کے بعد، مغربی سامراجیوں سے اپنی غصب شدہ آزادی واپس چھینی تھی! ــــ ان رہنماؤں سے ملاقات کی جنکی قیادت میں یہ ملک ــــ چین ــــ لیٹروں کے سرغنہ امریکہ کی لگاتار جنگی مداخلت کے باوجود ایک عظیم طاقت بن گیا ــــ!! اور پھر انھوں نے یہ تو دیکھا ہی ہوگا کہ اس ملک ــــ چین نے ــــ یہ ساری معجزانہ ترقیاں کسی بیرونی امداد یا خیرات کے سہارے نہیں بلکہ اپنے ہی وسائل اور اپنی ہی دولت کے مکمل واجتماعی، منظم ومرتب اور ایماندارانہ استعمال سے کی ہیں ــــ سچ ہے جب عوام پر اعتماد کیا جاتا ہے، جب عوام ہی ملکی وسائل کے مالک بن جاتے ہیں تو قوموں کی تقدیریں بدل جاتی ہیں۔

چینی رہنماؤں سے ہونے والے اپنے مذاکرات کو صدر ایوب نے "انتہائی مفید اور نتیجہ خیز" بتایا ہے۔ ان کی اس بات کی تائید وتوثیق ــــ ان کے دورۂ چین کے دوران بیانات اور تقاریر سے بھی ہوتی ہے اور پھر۔ دوسرا مشترکہ اعلامیہ ــــ بھی اپنی اہمیت اور افادیت کے لحاظ سے کم نہیں۔

اس اعلان میں کشمیری عوام کے حق خود ارادیت، انجمن اقوام متحدہ میں عوامی جمہوریہ چین کی شمولیت، مکمل سیاسی آزادی کے ــ استحکام کے لئے ــــ مکمل اور فوری اقتصادی آزادی کے حصول کی شدید ضرورت، چھوٹی اور بڑی قوموں کی مساوات، عالمی امن کی پائیدار اور شرطیہ ضمانت، بین الاقوامی تعلقات میں مزید وسعت، ایٹمی اسلحہ کے استعمال کی ممانعت اور انھیں برباد کردینے کے لئے تمام ملکوں کے سربراہوں کی کانفرنس کے انعقاد، اقوام متحدہ کی نئے سرے سے تنظیم، ہندچینی سرحدی جھگڑے کے پرامن حل کی تلاش کی ــــ پرزور حمایت کی گئی ہے نیز نسلی امتیاز، نوآبادیاتی نظام۔ بحرِ ہند میں امریکہ کے ساتویں بحری بیڑے کی مجرمانہ موجودگی، اور سامراج کی موثر مخالفت کی گئی ہے۔

مشترکہ اعلامیہ میں ان تمام نکات پر اتفاق واتحاد کے ساتھ ہی ساتھ ــــ پاکستان اور چین کے بڑھتے ہوئے موجودہ ثقافتی، سیاسی، اور معاشی تعاون پر اطمینان کا اظہار کیا گیا ہے۔ اور ان تعلقات میں مزید اضافہ کی توقع ظاہر کی گئی ہے۔

مشترکہ اعلامیہ میں الجزائر میں ہونے والی ایشیائی افریقی ممالک کی کانفرنس کا ذکر بھی بہت ہی پرامید لب ولہجہ میں کیا گیا ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ یہ کانفرنس ایشیائی افریقی ممالک کو ایک دوسرے سے قریب ترلانے نیز محکوم ونیم محکوم ممالک کی جدوجہد آزادی کو تیز سے تیز تر کرنے میں ممد ومعاون ثابت ہوگی۔ دوسری افریشیائی کانفرنس منعقد کرنے کی تجویز، عوامی جمہوریہ چین نے ہی پیش کی تھی اور اس وقت سے لے کر اب تک ہر ہر مرحلہ پر پاکستان نے اس تجویز کی بھرپور اور عملی تائید کی ہے جسکی وجہ سے افریشیائی برادری میں پاکستان کا کھویا ہوا وقار کسی حد تک بحال ہوا ہے۔ افریشیائی عوام اس کانفرنس سے بجا طور پر یہ توقعات وابستہ کئے ہوئے ہیں کہ کانفرنس میں شرکت کرنے والے زعما ــــ "انکے سیاسی، معاشی، تہذیبی اور سماجی مسائل کو حل کرنے کے لئے ایک خوشگوار ماحول اور سازگار فضا فراہم کرنے میں کامیاب وکامران ہوں گے۔

پچھلے زمانے میں پاکستان اور چین کے درمیان کئے گئے سرحدی اور تجارتی معاہدوں، ملکی رہنماؤں اور وفود کے باہمی تبادلوں، معاشی قرضوں، اخباری بیانوں اور مشترکہ اعلانوں سے توان حقائق کا صاف صاف پتہ چلتا ہے کہ دونوں ممالک ایک دوسرے کی دوستی اور خیرسگالی کے محتاج ہیں ــــ اور یہ بھی کہ عوامی جمہوریہ چین نے ہم سے تعلقات بہتر بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ حد تو یہ ہے کہ اپنے منہ کا نوالہ بھی پاکستان کو دیدیا ــــ پھر ہمیں اس بات کا احساس بھی ہے کہ اپنی خارجہ پالیسی کے مرکزی اور بنیادی مسئلہ کشمیر کے سلسلہ میں ــــ پوری مغربی دنیا سوائے فرانس کے اور خود روس اور اس کے طرفداروں کی بھارت نوازی کے پیش نظر ــــ ہمیں بہرحال اور بہر طور چین کی دوستی درکار ہے۔ لہٰذا اب یہ ہم پر منحصر ہے کہ ہم اپنے "دوست" ــــ اور "دوست نما دشمن" میں تمیز کریں ــــ اب یہ ہمارا فرض ہے کہ دولت مشترکہ، سینٹو اور سیٹو جیسے وطن دشمن حلقوں اور معاہدوں سے باہر نکلیں ــــ (باقی صفحہ ۳۹ پر)

اے وطن ......

محبِ وطن

حکومت نے صدارتی انتخاب کے زمانے میں "قیمتوں کے استحکام کی کمیٹی" بنائی تھی جو آجکل سرکاری رپورٹوں کے مطابق بڑی تندہی اور سرگرمی سے کام کر رہی ہے۔ اور اسکی سفارشات کی نوعیت کیا ہوگی۔ اس کے متعلق تو ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن صوبائی وزیرِ خزانہ جناب مسعود صادق نے اپنے طور پر یہ یقین دلایا ہے کہ آٹے اور گندم کی قیمتیں یقیناً کم ہو جائیں گی۔ اور تو اور انھوں نے تو یہ تک کہہ دیا ہے کہ "اب منافع خوری کے خاتمے کیلئے ٹھوس اقدامات کیئے جائیں گے ———" یہ اعلانات اور یقین دہانیاں کاغذی ہیں یا عملی ——؟ یہ تو خیر آنے والا وقت ہی بتائے گا۔ لیکن ان بیانات سے یہ احساس ہوتا ہے کہ شاید اب شہ نشیں رہنمایانِ گرامی بھی یہ بات ماننے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ اشیاءِ صرف کی قیمتیں حقیقتاً حد سے آگے بڑھ چکی ہیں۔ بڑھ نہیں چکیں بلکہ بڑھا دی گئی ہیں۔ اور قیمتیں بڑھانے والے سرمایہ دار اب حکومت کی اپیلیں اور گزارشات سننے اور ماننے کے موڈ میں نہیں ہیں اس لئے سرکاری پریس کانفرنسوں میں "ٹھوس اقدامات" کی باتیں کی جانے لگی ہیں ——— سچ پوچھئے تو یہ "ٹھوس" قدم اصولی طور پر بہت پہلے ہی اٹھائے جانے چاہیئے تھے لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے اور نہ کبھی مانیں گے ——— صنعتکاروں اور تاجروں کو ہزار بار آزمانے کے بعد اب اور ڈھیل دینا ——— کوئی ایمانداری، دانشمندی اور حب الوطنی نہیں ہے اور نہ ہوگی ——— یہ مفت خورے تو اسی وقت ٹھیک رہتے ہیں کہ جب انھیں کھونٹے سے باندھ کر رکھا جائے ورنہ بے مہار اونٹ کی طرح آگے ——— اور آگے بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں۔!

عوام دوستی کا تقاضہ تو یہ تھا کہ قومی سرمایہ دار اس ملک کے مسائل کو اپنے مسائل سمجھتا۔ لیکن برا ہو، منافع خوری کے "جذبۂ شیطانی" کا ——— کہ ہمارے ملکی سرمایہ دار نے بھی وہی روایتی قدریں اور اصول اپنائے جو سرمایہ دارانہ نظام کی خصوصیات ہیں۔ انھوں نے اس نوزائیدہ ملک میں ایک طرف تو صرف انھیں صنعتوں پر پیسہ لگا کر اپنی خودغرضی کا اظہار کیا جس میں کم از کم وقت اور لاگت سے زیادہ سے زیادہ کمایا جا سکے۔ دوسری طرف ملکی حالات سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے قیمتوں میں دن دونا رات چوگنا اضافہ کرتے رہے ——— سرمایہ دارانہ نظام نہ تو کسی منطق کو تسلیم کرتا ہے۔ اور نہ قومی مفاد کے اصول کو۔ نہ ہی "اخلاق" اس نظام میں کوئی اہمیت رکھتا ہے ——— اس میں تو صرف ایک ہی قدر ہے ——— اور وہ یہ ہے ——— "لوٹ کھسوٹ" ——— خواہ یہ منافع ہموطنوں کا خون چوس کر حاصل ہو یا بین الاقوامی میدان میں دھونس اور دھاندلی سے ——— اور پھر کیونکہ ہمارا اپنا ہموطن اور ہم مذہب سرمایہ دار یہ بھی جانتا ہے کہ آج ملک کی صنعت و حرفت ——— تعلیم اور معاشرت ——— پر ہی نہیں بلکہ ہر جگہ اس کا اپنا قبضہ ہے ——— خواہ انتظامیہ کی مشینری ہو یا اسمبلی کا ہال۔!

پچھلے چند سالوں میں جو مہنگائی بڑھی ہے اس کا سرسری جائزہ ہی یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ مذکورہ بالا باتیں کتنی صحیح ہیں اور ہمارا سرمایہ دار کتنا ہٹ دھرم اور بے حس ہے۔ ۱۹۴۷ء کی تو خیر کیا بات کی جائے۔ ابھی گزرے ہوئے سالوں میں آٹا سوا پانچ آنے سیر بکتا تھا۔ اور اب آٹھ نو آنے سیر بک رہا ہے ——— چینی تو ایک روپے پانچ آنے سے ڈھائی روپے سیر تک بکی ——— دس پونڈ بناسپتی گھی کا ڈبہ چار ماہ پہلے سولہ روپے کا ملتا تھا اب بائیس روپے میں مل رہا ہے۔ تیل ڈھائی روپے سے چار روپے ہو گیا۔ کوئلہ چھ روپے سے پندرہ روپے من کے حساب سے بکا۔ لکڑی ڈھائی روپے سے چار روپے من ہو گئی۔ گوشت گائے کا بارہ آنے سیر سے دو روپے تک اور بکری کا دو روپے سیر کی بجائے چار روپے سیر اور ساڑھے چار روپے سیر تک پہنچ گیا ہے ——— اونی کپڑوں کی قیمت میں تیس سے چالیس فیصد تک کا اضافہ ہوا ہے۔ اخبارات کی قیمت ۳۳ فیصد بڑھ گئی ہے ——— غرض ہر شے کی قیمت میں صرف چند سالوں میں بہت ہی تیز رفتاری آ گئی ہے ——— یہ بڑھتی ہوئی قیمتیں دن بدن عوام کی مجبوری اور لاچاری میں اضافہ کر رہی ہیں۔ انکی کمر ٹوٹ کر رہ گئی ——— اور پھر طرفہ تماشہ یہ کہ یہ سب کچھ اسوقت ہوا جبکہ انتظامیہ کے پاس ہمیشہ سے زیادہ اختیارات ہیں۔ پھر یہ تعجب اپنی جگہ الگ ہے کہ ان تمام حالات کے خلاف آواز اٹھانے والے طلباء، مزدوروں، کسانوں اور دانشوروں کو کچلنے کیلئے تو انتظامیہ فوراً چوکسی اور پھرتی سے میدان میں اتر آتی ہے۔ لیکن ان ملک اور عوام دشمن سرمایہ داروں کو کھٹکھٹانے میں بڑی بے بس نظر آتی ہے ——— اور پھر ستم ظریفی یہ کہ ——— یہ سب اس ملک میں ہوا جہاں مل میں کام کرنے والا ایک مزدور سو روپے کماتا ہے (یہ ہم فرض کئے لیتے ہیں ورنہ حقیقت حال تو اس سے بھی زیادہ خراب ہے۔ اور پھر یہ سو روپلی ماہوار حاصل کرنے میں مزدوروں، ٹریڈ یونین کارکنوں اور رہنماؤں کو کیا پاپڑ بیلنے پڑے۔ یہ ایک طلسم ہوشربا ہے جو پھر کبھی کیلئے اٹھا رکھئے) ہمارے زرعی مزدور کا حال تو اس سے زیادہ گیا گزرا ہے۔ تو بمشکل تمام روٹی اور صرف روٹی ——— میسر ہوتی ہے ——— تعلیم، لباس اور مکان کا تو ذکر ہی نہ کیا جائے تو بہتر ہے ——— جبکہ اس کے برعکس صورت حال یہ ہے کہ برسرِ اقتدار لوگوں اور زرداروں کے نجس کتے اور دوسرے پالتو جانور بھی ہزار درجے مہنگا اور بڑھیا کھانا کھاتے ہیں ——— لیکن تخریب پسندی کے جھوٹے الزام سے بچنے کی خاطر اگر ہم اس تلخ حقیقت سے قطع نظر بھی کر لیں تب بھی ان سب لوگوں کو جو ——— ہمارے ملک کی ——— پسماندگی کا ذکر کر کے ٹسوے بہاتے ہیں ——— جو اس ملک کی اجتماعی ترقی کے گیت گاتے ہیں ——— اور وہ بھی جو صنعتی ترقی کی اس رفتار اور اس اندازے سے مطمئن نظر آتے ہیں ——— ہاں ان سب کو آج کے بھوکے ننگے، محروم اور محتاج عوام چیلنج کرتے ہیں کہ وہ آئیں اور صنعتی اور زرعی مزدوروں کو یہ بتائیں کہ اتنی قلیل آمدنی میں صرف ہاتھ اور منہ کا جان لیوا رشتہ کس طرح برقرار رکھا جا سکتا ہے ——— یہ بات اب طے ہو چکی ہے کہ یہ مسئلہ پوشیدہ اور فرسودہ کتابوں میں لکھی ہوئی باتوں سے حل نہیں ہوگا۔ بلکہ اس کے لئے تو نئے اور انقلابی فکر اور ٹھوس اور فوری عمل کی ضرورت ہے۔

رونا اور افسوس تو اس بات پر ہے کہ کچھ بظاہر معقول اور پڑھے لکھے حلقوں کی طرف سے قیمتوں میں اضافے کے اس رجحان کا یہ جواز بھی پیش کیا جاتا ہے۔ کہ ترقی پذیر معیشت میں قیمتوں کا بڑھانا قدرتی بات ہے ——— یہ بڑی عجیب سی دلیل ہے کہ خام مال کی قیمت گرنے اور اس کے بڑھنے کے باوجود قیمتوں میں اضافہ ہوتا رہے حالانکہ اس امر کا علم معاشیات کے ایک ابتدائی طالب علم کو بھی ———

ہے کہ اصولی طور پر ان حالات میں قیمتوں کو گرنا چاہیئے۔ اگر یہ ممکن نہیں تو کم از کم ایک سطح پر تو رہنا ہی چاہئے ــــ قیمتوں کے بڑھنے کا تو کوئی جواز ہے ہی نہیں۔ لیکن ملک عزیز میں جو بات ہوتی ہے الٹی ہی ہوتی ہے۔ یہ عجیب ترقی ہے جس میں عوام کی قوت خرید گھٹ رہی ہے۔ ان کا معیار زندگی گر رہا ہے اور چند مخصوص لوگوں کے بنک بیلنس ہیں کہ بڑھتے ہی چلے جا رہے ہیں ــ بھاڑ میں جائے ایسی ترقی جس میں کوئی تو نان شبینہ کے لئے ترسایا جائے اور کوئی سونے میں تولا جائے ــــ

یہ حالات قومی استحکام اور بھلائی کے لئے۔ انتہائی تشویشناک ہیں اور ان کے سدباب کی فوری فکر کرنی چاہیئے۔ اور اب جبکہ ہم سے مستقبل کے متعلق جانے کیا کیا دعوے کئے جا رہے ہیں ــ یہ لازمی اور ضروری ہے کہ قومی معیشت کو متوازن بنانے کے لئے منصوبہ بندی کیجائے ــ پورا معاشی نظام سوشلسٹ خطوط پر تشکیل دیا جائے ــ کیونکہ قیمتوں کا بڑھنا تو اس وقت تک مقدر رہے گا جب تک کہ قومی ملکیت کے اصول کو نہ تسلیم کر لیا جائے۔ اور عوام کی دولت عوام کے سپرد نہ کر دی جائے ــــ اس کے علاوہ اور جو کچھ کیا جائے گا۔ وہ نہ موثر ہوگا۔ اور نہ پائیدار ــ قانون کی دفعات اور پریس کے بیانات ان بنیادی اور عملی تبدیلیوں کے بغیر بیکار ــــ ہی رہیں گے ــ کیونکہ ہم نے تو یہ دیکھا ہے کہ جن چیزوں کی قیمتیں ایک بار بڑھ گئیں وہ کبھی کم نہیں ہوئیں۔ اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام میں قیمتوں کو ایک سطح پر رکھنا ممکن ہی نہیں ہے ــ قیمتوں کو کسی نہ کسی بہانے، کسی نہ کسی حیلے بڑھنا ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ سرمایہ دار یہی چاہتا ھے ــــ!

مارکو پولو



صحرا بہ صحرا کو بہ کو ہندوستان

جمہوریت کی قتل گاہ

جمہوریت کے نام نہاد گہوارے ــــ بھارت میں بین الاقوامی سامراج اور ملکی سرمایہ داروں کے گھناؤنے اختلاط سے پیدا ہونے والے آمرانہ رجحانات ایک دفعہ پھر کیرالا میں عوامی فیصلوں کو للکارنے کی گستاخانہ جرأت کر رہے ہیں۔ جنوبی ہند کے علاقے کیرالا میں ــــ زمانہ ہوا کہ صدر راج نافذ ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہاں کانگریسی رہنماؤں کو عوام ناپسند کرتے ہیں اور انھیں منتخب نہیں کرتے مگر کانگریسی رہنما ــ کسی نہ کسی شکل میں وہاں حکومت کرتے رہنا چاہتے ہیں۔ ان کی اس آمرانہ خواہش کی تکمیل صدر راج نافذ کر کے کر دی جاتی ہے۔ مگر دنیا کو دکھانے کے لئے جمہوری انتخابات کا ناٹک ضرور کھیلا جاتا ہے۔ چنانچہ اب پھر کھیلا گیا۔ امید تو کانگریسیوں کو یہ ہی تھی کہ جیت جائیں گے اور کم از کم اتنی سیٹیں تو حاصل کر ہی لیں گے کہ وزارت بنا سکیں لیکن ؎

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

کانگریسی یہ انتخاب پھر ہار گئے۔ حالانکہ انھوں نے اس مرتبہ جیتنے کے لئے جانے کیا کیا جتن کئے تھے۔ انکی احمقانہ حرکتوں میں یہ حرکت بھی شامل تھی کہ انتخابات سے کچھ ہی عرصہ پہلے اپنے سب سے زیادہ طاقت ور حریف ــــ کمیونسٹ پارٹی کے کارکنوں اور رہنماؤں کو چن چن کر داخل زنداں کر ڈالا تھا۔ کہ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری لیکن ساری تدبیریں الٹی ہو گئیں۔ کانگریس کو صرف ۴۴ سیٹیں ملیں اور کمیونسٹوں کو ۴۰ ــــ اور پھر ایک دلچسپ پہلو اور ــ وہ یہ کہ منتخب ہونے والے ان کمیونسٹوں میں سے انتیس (۲۹) کمیونسٹ جیل میں ہی ہیں جو بذات خود اپنی انتخابی مہم میں براہ راست کوئی حصہ نہ لے سکے ــ!

مزے کی بات یہ ہے کہ اب مرکزی وزیر داخلہ جناب گلزاری لال نندا نے صاف صاف یہ کہہ دیا ہے کہ وہ نظر بند منتخب کمیونسٹوں کو رہا نہیں کریں گے کیونکہ وہ چین کے طرفدار ہیں اور چینیوں کی مدد سے ملک میں انقلاب برپا کرنے کے جرم میں ہی انھیں نظر بند کیا گیا ہے۔

خدا کی شان ہے کہ اب لاکھوں بھارتی عوام، حکمران پارٹی کی حکومت کی موجودگی اور تمام تر کوششوں کے باوجود، چین کے ایجنٹوں کو منتخب کرنے اور خود کانگریسی نیتاؤں کو ٹھکرانے لگے۔ بڑے مورکھ ہیں یہ بندے کہ کانگریسی رہنماؤں کی بات نہیں مانتے۔ لیکن کانگریس کے یہ کرتا دھرتا تو خوب ہیں کہ خود اپنے ہی ملک میں، اپنی ہی بنائی ہوئی عدالتوں میں اپنے ہی مرتب کئے ہوئے قوانین کے مطابق اپنے ہی وکیلوں کے ذریعہ بھارت کے غداروں کی غداری ثابت نہیں کرتے ــــ اور شاید یہ ہی وہ خوبی ہے جو بھارتی عوام نے کانگریس کے سترہ سالہ دور اقتدار میں دیکھی اور سمجھی ہے۔

کانگریسی نیتا اب مسلم لیگ یا دوسری چھوٹی جماعتوں سے ملکر وزارت بنانے کی ترکیبیں سوچ رہے ہیں ــ لیکن اس میں بھی انھیں خاطر خواہ کامیابی نصیب نہیں ہوگی۔ اس لئے انھوں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ صدر راج کی مدت میں اضافہ کر دیا جائے اور ۱۹۶۷ء میں ملک بھر کے عام انتخابات کے ساتھ کیرالا میں از سر نو انتخابات کرائے جائیں۔ یہ فیصلہ کانگریس کے مستقبل کو اور زیادہ تاریک کر دیگا۔ خود کمیونسٹ پارٹی نے مرکزی حکومت کے اس جانبدارانہ اور غیر جمہوری، رویّے کے پیش نظر یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ حکومت کے خلاف ملک گیر پیمانے پر ایک عظیم اجتماعی تحریک چلائے گی۔ کمیونسٹ رہنما نمبو دری پد نے حکومت کو متنبہ کیا ہے کہ وہ صوبے میں صدر راج برداشت نہیں کریں گے۔ کمیونسٹ لیڈر ہیرن مکرجی نے حکومت کے اس رویّے کو سیاہ ترین رویہ سے تعبیر کیا ہے۔ ایک اور کمیونسٹ لیڈر جیوتی باسو نے کہا ہے کہ حکومت نے پارلیمنٹری جمہوریت کی تمام روایات کو پیروں تلے روند ڈالا ہے اور اسکی یہ تمام حرکتیں نازیبا اور فسطائیت کی یاد تازہ کر رہی ہیں۔ انھوں نے بھارتی عوام کو ملک میں "رہی سہی، جمہوریت" کا تحفظ کرنے کے لئے میدان عمل میں کودنے کی دعوت دی ہے۔

کیرالا کے عوام میدان عمل میں اتر چکے ہیں انھوں نے اپنے نمائندے منتخب کر لئے ہیں اس علاقے کے جیالے عوام، حق و انصاف کو اس سے پہلے بھی منوا چکے ہیں ــــ اب بھی انھیں کوئی شکست نہیں دے سکتا۔

منشور
سب کا ہے
خود پڑھیئے
اور
دوسروں کو
پڑھائیے

مغربی جرمنی

بازی جو الٹ گئی

برطانیہ اور امریکہ نے مشرق وسطیٰ کی سیاسی بساط پر، نہر سویز اور اسوان بند کی زبردست ماتیں کھانے کے بعد اپنی بچی کھچی ساکھ برقرار رکھنے کیلئے دنیائے عرب کی سیاست میں براہ راست حصہ لینے کی بجائے کھاگ شاطر کی طرح اپنے ایک نئے مہرے ـــ مغربی جرمنی ـــ کو آگے بڑھانا شروع کیا تھا۔ مگر صدر ناصر کی جرأت مندانہ چالوں کے سامنے آخر کار یہ مہرہ بھی پٹ ہی گیا۔

صدر ناصر کی دعوت پر ـــ مشرقی جرمنی کے صدر البرائٹ کا قاہرہ میں زبردست سرکاری استقبال ہوا۔ انھیں مصر کا اعلیٰ ترین اعزاز "نشانِ نیل" دیا گیا۔ باہمی مفاد اور بھلائی کی باتیں کی گئیں ـــ لیکن یہ سب مغربی جرمنی کے حکمرانوں کو ایک آنکھ نہ بھایا اور بھلا کیوں بھاتا کہ ۱۹۵۵ء میں مغربی جرمنی کے وزیر خارجہ ـــ ہالسٹین نے یہ حکمت عملی مرتب کی تھی کہ مغربی جرمنی ـــ، مشرقی جرمنی کے دوستوں کا دشمن ـــ اور دشمنوں کا دوست رہے گا۔ مغربی جرمنی کی طرح عرب ممالک نے بھی یہ حکمت عملی مرتب کر رکھی ہے کہ وہ اسرائیل ـــ کے دوستوں کے دشمن اور دشمنوں کے دوست رہیں گے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی اس حکمت عملی کے تحت اس بات کا بجا طور پر برا مانا ہے کہ مغربی جرمنی نے پچھلے برسوں میں اسرائیل کو دو سو ملین مارک کا فوجی اور دوسرا سامان فراہم کیا ہے۔ اسی طرح وہ اس بات پر بھی ناراض ہیں کہ امریکہ، مغربی جرمنی اور اسرائیل کے درمیان ـــ سہ طاقتی معاہدہ کے تحت، امریکہ نے مغربی جرمنی کے ذریعے، اسرائیل کو ساٹھ ملین امریکی ڈالروں کا فوجی سامان دیا ہے۔ اسی لئے صدر ناصر کا یہ کہنا ہے کہ انھوں نے مغربی جرمنی جیسا ہٹ دھرم کہیں نہیں دیکھا یہ سب سے بڑا سامراجی اور اتنا ہی بڑا جھوٹا ہے کیونکہ یہ تو یہ دعوا کیا کرتا تھا کہ وہ عربوں کا دوست ہے۔ لیکن حقیقتاً وہ در پردہ اسرائیل کو امداد اور فوجی سامان دیتا رہا ـــ صدر ناصر نے اپنی اسی نفرت کی وجہ سے، مغربی جرمنی کو زک پہنچانے کے لئے ـــ مشرقی جرمنی کے صدر البرائٹ کو خصوصی دعوت دیکر بلایا تھا۔ جب مغربی جرمنی نے اپنی حکمت عملی کے مطابق اسرائیل کو تسلیم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس فیصلہ کا اعلان ہونا تھا کہ پوری دنیائے عرب میں غیظ و غضب اور احتجاج و انتقام کا طوفان آگیا انھوں نے اس فیصلے کو بدترین سامراجی اقدام قرار دیتے ہوئے یہ کہا کہ مغربی جرمنی نے اسرائیل کو تسلیم کرکے تمام عربوں کی پشت میں خنجر بھونک دیا ہے۔ عرب ممالک نے فی الحال اپنے سفیروں کو واپس بلانے پر اکتفا کیا ہے۔ اور یہ فیصلہ کر لیا ہے تعلقات قائم ہوں گے ویسے ہی وہ مغربی جرمنی سے اپنے سفارتی کہ جیسے ہی اسرائیل اور مغربی جرمنی کے درمیان سفارتی تعلقات توڑ لینگے۔ ساتھ ہی تمام رشتے ناطے ختم کر دینگے نہ صرف یہ بلکہ انھوں نے عربی تیل استعمال کرنے والے ممالک کو بھی الٹیمیٹم دیدیا ہے کہ اگر انھوں نے اسرائیل



البرائٹ اور ناصر ـــ نیا سفر نئے ساتھی

کو مالی یا فوجی امداد دی تو تمام عملی تعلقات فوراً ختم کر دیئے جائیں گے۔

مراکش کے شاہ حسین نے بھی جو بطور سرکاری مہمان، مغربی جرمنی کے دورے پر جا رہے تھے اس کے اس فیصلے کو ناقابل برداشت قرار دیتے ہوئے اپنا دورہ منسوخ کر دیا اور صدر ناصر سے اعلیٰ سطحی مذاکرات کرنے کے لئے قاہرہ پہنچ گئے۔ جہاں صدر ناصر انکے اس اقدام کو عرب تاریخ میں مثالی نمونہ سمجھتے ہوئے چشم براہ تھے۔ اس کے برعکس۔ تیونس کے سربراہ۔ بورقیبہ اس نازک مسئلہ اور موقع پر یہ کہتے پھر رہے تھے کہ عربوں کے سیاسی اور معاشی بائیکاٹ سے مغربی جرمنی مر نہ جائے گا۔ لیکن یہ کہنے کے باوجود یہ مغربی نواز ـــ عرب مدبر بھی ـــ عرب قوم پرستی کے تند و تیز سیلاب سے بوکھلایا ہوا ہے۔ اور عربوں کے متفقہ فیصلہ کو تسلیم کرنے کا یقین دلا رہا ہے صدر ناصر نے ـــ بورقیبہ کے اس رویہ کی مذمت کرتے ہوئے صاف صاف کہا ہے کہ مغربی جرمنی خیرات بانٹ کر عرب ممالک میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے تاکہ ـــ فلسطین کا مسئلہ ہی ختم ہو جائے لیکن سب جانتے ہیں کہ یہ لڑائی صدر ناصر اور مغربی جرمنی یا مصر اور مغربی جرمنی کے درمیان نہیں بلکہ یہ جنگ تو سارے عرب ممالک اور مغربی جرمنی کے سامراج کے درمیان ہے۔ لہٰذا اس معاملے میں کوئی عرب سربراہ اگر اب پیچھے ہٹا تو پھر وہ کبھی اس پر اعتبار نہ کریں گے۔

اگر اسرائیل کی ناجائز پیدائش کا تاریخی پس منظر ذہن میں نہ ہو تو صدر ناصر اور دوسرے عرب رہنماؤں کا یہ سخت رویہ اچھی طرح سمجھ میں نہیں آسکے گا۔

ایک مختصر سا خاکہ یہ ہے کہ "صیہونیت" کی تحریک کا مقصد، فلسطین میں یہودیوں کی اپنی قومی حکومت اور وطن کا حصول تھا۔ اس تحریک کی پہلی کانگریس سوئٹزرلینڈ میں باسیل کے مقام پر سنہ ۱۸۹۷ء میں منعقد ہوئی تھی۔ یہ تحریک بڑھتی اور پھیلتی رہی ـــ ۲ رنومبر سنہ ۱۹۱۷ء کو برطانیہ کے وزیر خارجہ اے جے بالفور نے برطانیہ کے سیاسی، معاشی، تہذیبی اور فوجی مفادات کے تحت اس تحریک کے متعلق ایک اعلان میں اپنی حکمت عملی کا اعلان کیا۔

ملک معظم کی حکومت، فلسطین میں، یہودیوں کے قومی وطن کے قیام کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتی ہے۔ اور وہ حصول مقصد کو سہل و آساں بنانے کیلئے اپنی بہترین کوششیں صرف کرے گی ـــ!

"اعلان بالفور" کے مطابق، انگریزوں اور یورپ کے دوسرے مالدار یہودیوں کی مدد سے یہودی، فلسطین میں آہستہ آہستہ آباد ہونے لگے۔ دوسری عالمی جنگ میں ہٹلر کے مظالم کی وجہ سے یہودیوں کی ایک بہت بڑی تعداد نے فلسطین میں پناہ لے لی اور وہاں کے عربوں کو مار پیٹ کر نکال باہر کر دیا۔ ظاہر ہے کہ عربوں اور یہودیوں کے مذہبی اختلافات بڑھ کر سیاسی معاشی، تہذیبی اور فوجی شکل اختیار کرنے لگے اور جب ۱۴ رمئی سنہ ۱۹۴۸ء کو یہودیوں نے فلسطین میں اپنی ایک آزاد مملکت "اسرائیل" قائم کر لی تو پھر تو مستقل طور پر ٹھن گئی۔ اب ذرا امریکہ بہادر کی بھی سن لیجئے ہیری ٹرومین کا کہنا ہے کہ اپنے ایک پرانے دوست اور تجارتی کاروبار میں شریک حصہ دار مسٹر ایڈی جیکبسن کے اصرار پر انھوں نے یہودی لیڈر شیم ویزمان کا استقبال کیا اور اسرائیل کو تسلیم کرنے



بساط ـــ جو الٹ گئی

کا فیصلہ کرلیا اور اس طرح امریکی صدر کی تجارتی خودغرضیوں اور امریکہ میں یہودیوں کے معاشی غلبہ کی بدولت امریکہ نے بھی اسرائیل کو مان لیا اور عملی سرپرستی شروع کردی۔ شروع شروع میں تو اسرائیل میں صرف پانچ لاکھ چھ ہزار، یہودی آباد تھے۔ لیکن اب انکی آبادی ۱۸ لاکھ تک پہنچ گئی ہے۔ اور روز بروز بڑھتی ہی جاتی ہے اور اس کے نتیجے میں فلسطین کے عربوں کو بلاقصور خانماں برباد کردیا گیا ہے۔ جوکہ آج سارے عرب ممالک کی غیرت کو للکار رہے ہیں۔ عربوں کا کہنا ہے کہ مغربی جرمنی اس جھگڑے میں اپنی ٹانگ کیوں اڑا رہا ہے وہ خود تو جرمن اتحاد کے نعرے لگاتے نہیں تھکتا۔ مگر فلسطین کے عوام الناس کے حقوق کی تائید وحمایت میں وہ اپنی زبان سی لیتا ہے۔

چانسلر ایڈ ہینار نے تو سویت یونین سے (جو کہ مشرقی جرمنی کا عظیم ترین دوست ہے) مغربی جرمنی کے معاشی اور سیاسی مفادات کی خاطر سفارتی تعلقات قائم کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ یہ تو "استثناء" ہے عربوں کا کہنا ہے کہ ہم اس قسم کے کسی "استثناء" کو نہیں اپنائیں گے۔ "اسرائیل کا دوست، عربوں کا دشمن اور اسرائیل کا دشمن عربوں کا دوست" بس یہی ہماری بنیادی پالیسی ہے۔ اسی لیے انھوں نے مغربی جرمنی کے خلاف باقاعدہ جوابی کارروائی شروع کردی ہے۔

مغربی استعمار کے خلاف لڑی جانے والی اس رزمیہ جنگ کے ہیرو بلاشبہ صدر ناصر ہیں۔ بھلا کون سوچ سکتا تھا کہ مصری فوج کا ایک معمولی سپاہی وقت آنے پر نہ صرف مصر و عرب بلکہ ساری محکوم و نیم محکوم دنیا میں سامراج دشمنی کی ایک واضح علامت اور ایک قابل تقلید رہنما بن کر ابھرے گا۔

"مغربی جرمنی مصر کو مزا چکھانا چاہتا ہے۔ میں متنبہ کرتا ہوں کہ اے عقل کے دشمنو! کان کھول کر سن لو ہمارا کوئی بال بیکا نہیں کرسکتا ـــــ!"

صدر ناصر نے مغربی سامراج کے چھکے چھڑا کر رکھ دیئے ہیں۔ دنیائے مغرب اور دنیائے عرب کے درمیان ہونے والے اس سنگین اور پیچیدہ تصادم میں جیت یقیناً عربوں کی ہی ہوگی ـ۔

ویٹ نام

امریکی سامراج

تیسری جنگِ عظیم کی تیاریاں

امریکی سامراج نے اب تک تسلیم شدہ، بین الاقوامی قوانین کی جتنی دھجیاں ویٹ نام میں اڑائی ہیں وہ اس کے چہرے سے جنگ پسندی کی کالک کبھی نہ چھٹنے دیگی۔ اس امن دشمن ملک کے سربراہوں کے سر میں دنیا پر حکومت کرنے۔ انھیں اپنے اشاروں پر نچانے کا سودا، سمایا ہوا ہے۔ لیکن وہ جانتے بوجھتے یہ نہیں سمجھتے کہ تو آزاد خود مختار قومیں مظالم کے آگے سر نہیں جھکاتیں بلکہ ہر میدان میں ان کا ڈٹ کر مقابلہ کرتی ہیں۔

اس وقت تک امریکہ نے شمالی ویٹ نام پر حملہ کرنے کے جتنے بھی جواز دنیا کے سامنے پیش کئے وہ اتنے پھسپھسے ہیں کہ انھیں تمام ممالک نے مسترد کردیا۔ اور آج دنیا بھر کے لوگ امریکہ کے ان جارحانہ اقدامات کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے ہر جگہ احتجاجی مظاہرے کر رہے ہیں۔ اور اب تو امریکہ کی انصاف پسندی کے اس شکستہ تابوت میں آخری کیل بین الاقوامی کنٹرول کمیشن کے اراکین نے بھی ٹھونک دی ہے۔ اس کمیشن کے دو ارکان پولینڈ اور امریکہ کے نورِ نظر ہندوستان نے ۱۹۵۴ء کے جنیوا کانفرنس کے دونوں صدر برطانیہ اور روس کو اپنی عبوری رپورٹ میں بتایا ہے کہ امریکہ نے ۷، اور ۸ فروری کو شمالی ویٹ نام پر حملہ کرکے معاہدہ جنیوا کی خلاف ورزی کی ہے۔ معاہدہ جنیوا کے تحت ہی ویٹ نام کو شمالی اور جنوبی دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ اور اس معاہدے میں یہ بھی تسلیم کیا گیا تھا کہ دونوں حصوں میں کوئی غیر ملکی فوج نہیں رہے گی۔ نیز دونوں ممالک ایک دوسرے کی سرحدوں کا احترام کریں گے۔ لیکن امریکہ نے اپنے محکمہ سراغرسانی سی آئی اے کی رسوائے زمانہ سازشوں کے ذریعہ جنوبی ویٹ نام کو عملاً اپنی الگ نوآبادی میں شامل کر رکھا ہے اور اب وہی سازشی شمالی ویٹ نام کی طرف افسوسناک نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔

دنیا کے تمام ممالک چاہتے ہیں کہ اس مسئلہ کا، کوئی پر امن حل ہو۔ اور دوسری جنیوا کانفرنس منعقد کر کے اس مسئلہ کا کوئی مستقل حل تلاش کیا جائے۔ لیکن امریکہ کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے امن قائم رکھنے کی تمام کوششیں ناکام ثابت ہو چکی ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ امریکہ خود اپنی لونڈی اقوام متحدہ کے کٹھ پتلی منتظم اعلیٰ اوتھانٹ کی اپیل سننے کے لئے بھی تیار نہیں ہے۔ جو بار بار مصالحت کے لئے رو رہے ہیں۔

امریکیوں کی موجودگی کی وجہ سے پورے ویت نام میں آگ اور خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے اور اب اس آگ کو صرف ویت نام تک محدود رکھنا ممکن نہیں رہ گیا ہے۔ کیونکہ امریکہ نے حال ہی میں سترھویں متوازی لائن سے آگے تک بمباری کرنا اپنا روزمرہ کا مشغلہ بنا لیا ہے۔ امریکی فوجیں دھڑا دھڑ ویت نام پہنچ رہی ہیں لیکن دعویٰ یہی کیا جا رہا ہے کہ امریکہ اس علاقے میں جنگ پھیلانے کا خواہشمند نہیں۔ یہ جھوٹ اتنی بار بولا جا چکا ہے کہ اب نہ تو اس پر کوئی یقین کرتا ہے اور نہ ہی سننے کے لئے تیار ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ ہوائی حملے کے بعد امریکہ یہی اعلان کریگا۔

ویت نام میں صورت حال ہر لمحہ اور ہر گھڑی خراب ہوتی جا رہی ہے۔ کہا نہیں جا سکتا کہ امریکہ کے یہ جارحانہ عزائم کیا رنگ لائیں گے۔ لیکن اتنا تو دعوے کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ویت نام کے نڈر اور جیالے عوام اپنی سرزمین کو امریکہ کے ناپاک اثرات سے پاک کر کے رہیں گے ــــ اور ایک نہ ایک روز امریکہ کو ذلت اور رسوائی کے ساتھ ویت نام سے نکلنا پڑے گا کیونکہ باعزت سمجھوتے کی راہیں خود امریکہ کے نام نہاد مدبروں نے بند کر دی ہیں۔

امریکہ کی انتہائی اشتعال انگیز کارروائیوں کے باوجود ابھی تک شمالی ویٹ نام نے جوابی کارروائی شروع نہیں کی ہے۔ اور ابھی تک انسانی تہذیب کو تیسری جنگ کا ایندھن بنانے سے روکے رکھا ہے۔ لیکن یہ کب تک ممکن ہے ـــــ؟ امریکہ تیسری جنگ عظیم چھیڑنے پر تلا ہوا ہے ـــــ وہ یہ جنگ ایشیا کی سرزمین پر لڑنا چاہتا ہے اور اس لئے کہ جارحانہ کارروئیاں صرف ویت نام کے لئے نہیں بلکہ پورے ایشیاء کے لئے ہیں۔ اس لئے امن، انسانیت، اور آزادی کے تحفظ کے لئے ایشیاء میں رہنے والوں کا خاص طور پر اور تمام دنیا کے امن دوست انسانوں کا عام طور پر فرض ہے کہ امریکی سامراج کا مقابلہ کریں ؂

ہنس کر گزار دے

آفاق احمد

جب چہرے پر تلخیاں بسیرا کئے ہوں، دل میں امنگیں تھک ہار کر سو گئی ہوں، اور ذہن میں آگ جل رہی ہو، اسی وقت آپ باغ میں جائیے ادھر ادھر نظر دوڑائیے سب کچھ دیکھ ڈالئے۔ آپ عجیب سا محسوس کریں گے صبح کی ہوائیں آپ کو آندھی کے جھکڑوں جیسی بے رونق نظر آئے گی۔ بند شگوفوں کو آپ ایسا جانیں گے جیسے آپ کی قسمت میں لکھے سکھوں پر کسی نے سخت سخت پنکھڑیوں کا پہرہ لگا کر محاصرے میں لے لیا ہو۔ پتوں کی سرسراہٹ میں آپ کو ویران روحوں کے نالے سنائی دیں گے۔ شبنم کے قطرے آنسو بن جائیں گے گلاب کے پھول حرماں نصیب عاشقوں کی طرح غم محبوب میں خون تھوکتے نظر آئیں گے۔ چاروں طرف ویرانی کا ڈیرہ ہوگا۔ سب آپ کا مذاق اڑا رہے ہونگے آپ گھبرا جائیں گے، آپ رو دیں گے۔

آپ اداس جو ہیں۔!

آپ کی روح میں سارے جہان کا الم جو بسا ہوا ہے۔!

"سارے جہاں کا دکھ میرے ہی حصّے میں کیوں آیا ہے!" آپ یہی سوچ رہے ہیں۔

مگر آپ یہ کیوں سوچ رہے ہیں؟ یہ غموں کا بکھیڑا تو آپ نے خود ہی مسلّط کیا ہے۔ دامن کو ذرا جھٹکیے پیشانی کی شکنیں صاف کیجئے۔ ہونٹ کس کر کیوں جکڑ رکھے ہیں۔ انھیں آزاد چھوڑ دیجئے۔ پھر آیئے میرے ساتھ باغ میں۔ یہ بھول جایئے کہ ابھی ابھی کسی نے آپ کا دل توڑ دیا تھا۔ ابھی ابھی آپ یہاں ویرانی دیکھ گئے تھے

دل بہت نازک ہوتا ہے نا ــ؟ اس لئے دل کو بار بار مت ٹوٹنے دیجئے۔ کبھی آپ نے کالر پر جمی مٹی کو انگلی کی ہلکی سی جنبش سے چھڑایا ہے؟ بس بالکل اسی طرح غموں کو جھٹک دیجئے۔ کسی نے آپ کا دل توڑ دیا۔ دنیا بہت بڑی ہے آپ کہیں اور دل لگایئے آپ کائنات جیت لیں گے۔!

پھر آپ کو ایسا نہیں لگے گا کہ آپ بیمار ہیں۔ آپ یہ نہ سوچیں گے کہ کنول کیچڑ میں کیوں ہوتا ہے، گلاب میں کانٹے کیوں ہوتے ہیں۔ یہ سب بیمار ذہن کے سوال ہیں ــ کنول حسین ہے، اس پر پانی کے قطرے موتیوں کا ہار ہیں۔ گلاب کی پنکھڑیاں طرحدار ہیں، نازک ہیں بس دیکھتے رہیئے! کھو جایئے ــ سوچ کا وہ طریقہ غلط تھا جو آپ نے اپنایا تھا۔ وہ بھٹکانے والا تھا۔ گہر کو قطرہ بنانے والا۔

آپ ابھی ابھی اسی جگہ سے گئے تھے۔ وہی باغ ہے مگر تب میں اور اب میں کتنا فرق ہے۔

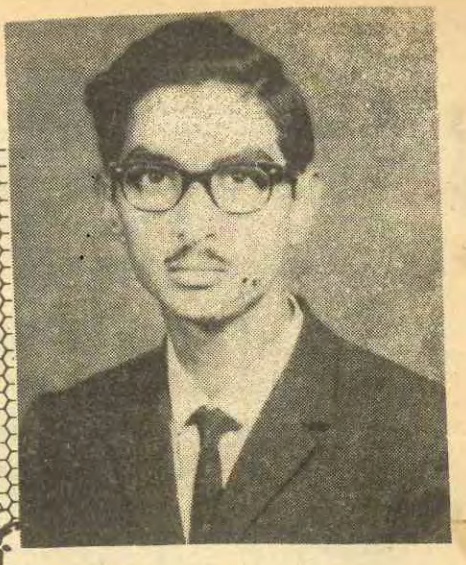
آپ کے چہرے پر تلخی کی کوئی شکن نہیں۔ دل کی ایک ایک امنگ جاگ گئی ہے۔ ذہن میں پھول کھل رہے ہیں ــ حالانکہ اس وقت ہوائیں پہلی کی سی تازگی اور سبک سری نہیں۔ لیکن آپ کو ایسا لگ رہا ہے جیسے اس کا ہر جھونکا سیدھا جنت کی راہ سے آ رہا ہے۔ اور اپنے پیچھے راگ و رنگ کی ترنگیں چھیڑ رہا ہے بند شگوفے کھلا چاہتے ہیں۔ ابھی ابھی ان کی نرم و نازک پنکھڑیوں کا حصار توڑ کر ان میں سے خوبصورت پھول نکلے گا۔ خوشبو مہکنے لگے گی۔ آپ اسے توڑ کر کالر میں لگا لیں گے ــ نہیں! ایسا مت سوچئے ــ دو گھڑی کے لئے اسے بھی اس دنیا میں جی لینے دیجئے مان گئے آپ؟۔ اچھا کیا! شاید اس غنچہ نو شگفتہ نے آپ کے ارادے کو بھانپ لیا ہے۔ جبھی تو دیکھئے ایک دم پنکھڑیوں کو سجانے لگا ہے۔

آپ کتنے خوش ہیں اس وقت ــ یہ سارا گلشن آپ کی خوشیوں میں شریک ہے ــ پتے سرسرا کر تالیاں بجا رہے ہیں۔ آپ کا استقبال کر رہے ہیں۔ شبنم کے قطرے موتیوں جیسے چمک رہے ہیں، آپ کے قدموں میں بچھے جا رہے ہیں۔ گلاب کے پھولوں کو تو دیکھئے کس طرح انداز بتا بتا کر سو رخ سے پینگیں بڑھا رہا ہے۔ اسکی سرخی ایسا لگتا ہے۔ جیسے بہار کا سب سے حسین رنگ یہی ہو۔

ہر طرف نکھار ہے۔ ہر سو بہار ہے۔ سب آپ کی خوشی میں شریک ہیں۔ آپ صرف مسکرائے سب جگہ قہقہے برسنے لگے۔ سارا ماحول رقص، کرنے لگا۔

ایک آپ کیا ہنسے، سب جی اٹھے۔

اس لئے مجھے آپ سے اتنا کہنا ہے کہ، اداس ہونے، سوگوار ہونے کی کوئی بات نہیں۔ دو گھڑی کی زندگی ہے۔ آپ کی مسکراہٹوں کے ساتھ کتنی ہی خوشیاں جڑی ہوئی ہیں۔ اپنے لئے نہیں تو دوسروں کے لئے سہی۔ قہقہوں کو آزاد چھوڑ دیجئے۔ لبوں کی پنکھڑیوں کے کونے لرزنے دیجئے آنکھوں کے ستارے چمکنے دیجئے۔ آپ ذرا مسکرائیں گے سارا جہان کھلکھلانے لگے گا۔



کشکول

سید نجم الحسن رضوی

چوراہے کی سرخ آنکھ اچانک بیدار ہوئی تو سنہرے رنگ کی ہلکی سی ایمپالا ایک خفیف سے دھچکے کے ساتھ رک گئی۔ اس کے آگے اور پیچھے نیلی پیلی اور لال موٹروں کی لمبی سی قطار تھی۔ ایمپالا کے آگے سیاہ رنگ کی شیورلے تھی جس کے ڈرائیور نے کھڑکی سے اپنی گردن نکال کے باہر جھانکا اور گاڑی کو تھوڑا سا بیک کیا۔ بیگم صاحبہ نے پرس نکال کر لپ اسٹک نکالی اور فرصت کے لمحے سے انتقام لینے کی خاطر نہایت چابکدستی سے منقار رنگنے لگیں۔ اس نے کوٹ کی جیب سے سگرٹ کیس نکالا اور پھر سگرٹ جلا کر کھڑکی کے نیلے شیشوں پر کھینچے ہوئے پردے ہٹا کر باہر دیکھنے لگا۔ روشن سڑک پر دوسری جانب کا ٹریفک رواں دواں تھا اور لمبی لمبی، چمکدار گاڑیاں ایک دوسرے کے تعاقب میں تیر رہی تھیں۔ ڈرائیور اپنی پی کیپ پیشانی پر جھکائے دونوں ہاتھ اسٹیرنگ وہیل پر رکھے سگنل کو گھور رہا تھا اسی وقت ایک اخبار والا اخباروں کا پلندہ لیے کار کی کھڑکی کے پاس آیا۔ "نیوز پیپر، تازہ نیوز پیپر، ڈان پاکستان ٹائمز، ڈیلی نیوز۔ جنگ انجام حریت۔!"

"نہیں چاہیئے!" ڈرائیور نے اسکی طرف دیکھے بغیر سر سا جواب دیا۔ اخبار والا دوسری کار کی جانب بڑھ گیا اس نے کھڑکی کا شیشہ آدھا گرا لیا اور اطمینان سے کہنی باہر نکال کر بیٹھ گیا سگرٹ کا ایک لمبا سا کش لے کر اس نے دھواں باہر نکالا۔ جب دھواں چھٹا تو اسے ایک زرد مرجھایا ہوا چہرہ نظر آیا۔ اور ساتھ ہی اسکی جانب بڑھا ہوا ایلومنیم کا پچکا ہوا ایک پیالہ! "بابا اللہ کے نام پر ایک پیسہ۔!" — وہ بوکھلا کے پیچھے ہٹا۔ اس نے اضطراری طور پر جیب میں ہاتھ ڈالا اور پرس میں سے کچھ سکے نکال کر پیالے میں ڈال دیئے۔ زرد چہرہ سامنے سے ہٹ گیا۔ ایلومنیم کا پچکا ہوا پیالہ نظروں کے سامنے سے غائب ہو گیا۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن پھر اسی وقت ایک کمزور سی پتلی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی "بابو جی! یتیموں کی مدد کیجئے اللہ آپ کو خوش رکھے!" اس نے جھانک کر دیکھا دو چھوٹے چھوٹے بچے اسکی جانب ننھی ننھی میلی ہتھیلیاں پھیلائے کھڑے تھے۔ "بابو جی صبح سے کچھ نہیں کھایا۔" اس کے دل میں ایک بار پھر ہمدردی کی لہر ابھری۔ اس نے کچھ سکے نکال کے ننھی ننھی ہتھیلیوں پر رکھے ننھے ننھے تھرتھراتے ہوئے ہاتھ غائب ہو گئے۔ پھر دوسری، جانب سے کوئی بوڑھا فقیر کار کے شیشوں پر انگلیاں بجانے لگا۔ اس کا ایک ہاتھ مفلوج تھا۔ اور دوسرے ہاتھ کی کانپتی ہوئی انگلیاں کار کے شیشوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ اسکی الجھی ہوئی خوفناک داڑھی اور سرخ سرخ آنکھیں دیکھ کر بیگم صاحبہ ہونٹوں کو پینٹ کرنا بھول گئیں فقیر نے ہاتھ پھیلا کر دردناک سی آواز میں کہا۔ "مائی کی خیر بابا کی خیر!"

ڈرائیور نے مڑ کر دیکھا اور ترش لہجے میں کہا۔

"معاف کرو بابا۔! فقیروں کی کوئی انتہا نہیں ہے جہاں دیکھو وہاں موجود۔ اب بھلا اس بیچ سڑک میں کیا تک ہے۔؟" اتنے میں پیچھے سے ایک بوڑھی عورت لاٹھی ٹیکتی ہوئی کار کی کھڑکی کے پاس آگئی۔

"اندھی محتاج ہوں بابا اللہ کے نام پر خیرات!"

اس نے اپنے کپکپاتے ہاتھوں سے جھولی پھیلائی۔ اسی وقت سگنل سبز ہو گیا۔ ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ سنہرے رنگ کی لمبی ایمپالا جو ایسا لگتا تھا کہ جیسے دھوپ سے تراشی گئی ہے۔ معمولی سی جھرجھری لیکر تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ سرخ آنکھوں والا بوڑھا فقیر اور بوڑھی عورت جو لاٹھی ٹیکتی ہوئی چل رہی تھی سڑک کے کنارے چلے گئے اور ٹریفک تیزی کے ساتھ گزرنے لگا۔ اس نے سگرٹ کے ٹکڑے کو کار سے باہر اچھالتے ہوئے ایک نظر پیچھے دیکھا بوڑھا فقیر ابھی تک نامعلوم سمت میں ہاتھ پھیلائے کھڑا تھا۔ اسکی پھیلی ہوئی پانچوں انگلیاں، بڑھے ہوئے زرد ناخن اور گندی پھیلی ہوئی ہتھیلی جیسے اس کا پیچھا کرنے لگی۔ اس نے محسوس کیا جیسے بوڑھے فقیر کا پھیلا ہوا ہاتھ اس سے کچھ پوچھنا چاہتا ہو۔؟ پھیلا ہوا ہاتھ۔ ایک سوال۔ ایک بے عنوان کہانی۔ ایک معمہ۔ ایک پہیلی۔ ایک طنز۔ اس نے سوچا، کیسا عجیب ہاتھ تھا؟ کیسا عجیب سوال تھا۔ کیسی عجیب کہانی تھی اور کیسا کٹیلا طنز تھا۔

اس نے سوچا کہ وہ بھی دوسرے بڑے لوگوں کی طرح اس سوال سے کترا کے نکل جائے، ذہن سے اس کہانی کے خدوخال جھٹک دے اور اس کٹیلے طنز کی تلخی کو جو اس کے جگر تک اتر گیا تھا تھوک ڈالے۔ اس نے دوسرا سگرٹ جلایا۔ لیکن دیا سلائی کے شعلے کے ساتھ اس کے ذہن میں پھر وہی پھیلا ہوا ہاتھ ابھر آیا۔ اس نے سوچا کہ ان پھیلے ہوئے ہاتھوں۔ ایلومنیم کے پچکے ہوئے پیالوں اور کپکپاتی لرزتی انگلیوں کے سہارے آگے بڑھی ہوئی جھولیوں سے کون کہاں تک بچ سکتا ہے؟ جب تک آنکھیں سلامت ہوں اور آنکھوں میں روشنی رہے اور جب تک بدن میں ضمیر کی حرارت موجود ہے اور جب تک دل دھڑکتا ہے اس وقت تک ان سے فرار ممکن نہیں اور جب کوئی شخص ان پھیلے ہوئے ہاتھوں کی گرفت سے نکل جائے ان کپکپاتی لرزتی انگلیوں کے نیچے سے باہر ہو جائے۔ جب یہ کپکپاتے لرزتے ہونٹ اور اداس زرد چہرے اسکی آنکھوں میں کوئی شعلہ نہ پیدا کر سکیں اور اس کے دل کے کسی گوشہ میں کوئی اجنبی سا درد کروٹ لے اس وقت یہ سمجھو کہ اس آدمی کی آنکھوں میں پتلیاں نہیں اشرفیاں ہیں اور اس کے سینے میں مکمل اندھیرا ہے۔ اور وہ یا تو "بڑا" آدمی ہے۔ یا "بڑا" آدمی بننے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس نے سوچا کہ اس معیار سے تو وہ "بڑا" آدمی تھا۔ نہ بن سکتا تھا کیونکہ بچپن سے آج تک، طالب علمی کے دور سے اب تک، نجانے کتنی ہی بار اسکی آنکھوں میں شعلوں نے رقص کیا تھا اور پلکوں کی ڈوریوں میں شبنم اتری تھی اور سینے میں دھواں اٹھا تھا سب سے پہلے اسے فرانسس لوکس کی وہ معرکتہ الآرا پینٹنگ یاد آئی جو اس نے آرٹ گیلری میں دیکھی تھی "ماں اور بچہ" ماں کے چہرے پر اس قدر حسرت تھی، درد تھا اور کرب کی پرچھائیاں تھیں کہ اسے ایسا لگا جیسے اسکی آنکھوں

میں سردیوں کی کوئی یاس انگیز شام رینگ رہی ہے۔ اور سینے میں دھواں بھرنے لگا۔ جب وہ بلڈنگ دیکھ کر باہر نکلا تو اسے فٹ پاتھ پر ایک نیم عریاں عورت نظر آئی۔ جو آنکھوں میں آنسو بھرے گود میں اپنا بچہ سمیٹے بیٹھی تھی۔ اور آنے جانے والوں کو بڑی حسرت سے تک رہی تھی اسکی خستہ حالی اور اس کا پھیلا ہوا ہاتھ گویا آرٹ گیلری سے برآمد ہونے والوں سے یہ پوچھ رہا تھا کہ بتاؤ میں زیادہ حقیقت انگیز ہوں یا فرانسس لوئس کی پینٹنگ وہ اس جیتی جاگتی تصویر کو دیکھ کر ٹھٹھک کے رکا اور اسی وقت اس کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ہر قسم کا آرٹ زندگی کا مذاق اڑانے کی ناکام کوشش ہے۔ پھر اسے وہ دو معصوم صورتوں والے ننھے بچے یاد آئے جو پھیلے ہاتھ میں لئے ایکبر تبہ اسے ایک بحر ہاؤس میں ٹکرا گئے تھے سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے ننھے جسم، نیلے ہونٹ اور کپکپاتے ہوئے ہاتھ۔ لیکن اس کے باوجود انھیں اپنے فرض کا کیسا احساس تھا۔ "بابو جی اللہ کے نام پر خیرات!"

"بابو جی۔ یتیم بچے ہیں ماں باپ اٹھ گئے۔"

وہ ان بچوں کو دیکھ کر رکا۔ اس نے ان کے پیالوں میں کچھ سکے ڈالے اور سوچنے لگا یہ بچے جو پھول ہیں جو کائنات کی رونق ہیں۔ جو گھر کی بہار ہیں۔ جو چاند ہیں۔ تارے ہیں۔ جو جگر کے ٹکڑے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں یہ پیالے کیوں ہیں؟ ان کے ہاتھوں کے گلاب اتنے مرجھائے ہوئے کیوں ہیں۔ ان کے چہروں کی سرخی، ان کی آنکھوں کی چمک، انکی طبیعت کی شوخی، ان کی رگوں کی حرارت کہاں گئی؟ کیا انہیں۔ جوش دیکھنے والا۔ ان کے نازنخرے اٹھانے والا کوئی نہیں۔؟ کوئی نہیں جو انھیں شفقت سے دعا دے سکے، ان کے اچھے مستقبل کی تمنا کر سکے ان کے ہاتھوں میں ستارے دیکھنے کی خواہش کر سکے۔ اب ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں، انکی پیشانی پر چمک نہیں۔ ان کے گالوں پر سرخی نہیں۔ انکی طبیعت میں شوخی نہیں ان کے ہاتھوں میں ستارہ نہیں پیالہ ہے اور پیالے میں چند سکے ۔۔۔!

پھر اسے سرخ آنکھوں اور الجھی ہوئی خوفناک داڑھی والا وہ بوڑھا فقیر یاد آیا جو ہاتھ پھیلائے کالج کے پاس کھڑا تھا اور وہ اندھی بھکارن جو لاٹھی ٹیکتی ہوئی آئی تھی۔ اس کا پھیلا ہوا ہاتھ اور اسکی خالی جھولی!

اس نے سوچا پھیلا ہوا ہاتھ۔ ہاتھ نہیں۔ ایک لاجواب سوال تھا، اور خالی جھولی محض جھولی نہیں ایک پریشان کن کہانی تھی۔ اسکی نظروں کے سامنے بہت سے پھیلے ہوئے ہاتھ اور بہت سی خالی جھولیاں اور بہت سے بڑھے ہوئے پیالے گھوم گئے۔ شہر میں گھومتے گھومتے، دفتر جاتے ہوئے، دفتر سے آتے ہوئے، راستے میں سڑک کے موڑ پر، سینما میں۔ ریستورانوں میں، فٹ پاتھ پر، موٹر کی کھڑکی میں۔ کہیں آپ اس پھیلے ہوئے ہاتھ کو نظرانداز نہیں کر سکتے۔ اس نے سوچا، لالو کھیت سے کیماڑی تک، نیو کراچی سے کورنگی تک۔ صدر میں ایلفی پر، بندر روڈ پر۔ کہیں بھی ان سے فرار ممکن نہیں۔ یہ پھیلا ہوا ہاتھ ہر جگہ ہے۔

یہ ایلومینیم کا پیالہ، یہ ٹین کا برتن، یہ کاسۂ گدائی یہ خالی جھولی کہاں نہیں۔؟

یہ سارے لوگ کون ہیں؟ آخر یہ سب کیا مانگ رہے ہیں، ان کا سوال کیا ہے؟

اس کا جواب کس کے پاس ہے؟ یہ سوال کیا ہے جس کا کوئی جواب نہیں۔؟؟

اس نے سوچا کہ وہ خالص گوتم بدھ کے انداز میں سوچ رہا ہے۔ وہ اس خیال پر دل ہی دل میں ہنسا، ہر شخص اپنے وقت کا گوتم ہے۔ فرق اتنا ہے کہ گوتم نے وقت کو قید کر لیا تھا۔ لیکن یہاں وقت نے گوتم کو قید کر رکھا ہے۔ اور جب وقت گوتم پر غالب آجائے اور جب وقت گوتم کو اپنا پابند بنالے۔ تو گوتم پھر گوتم نہیں رہتا، وقت کے زنداں میں گرفتار ہو کے گوتم کی شخصیت فنا ہو جاتی ہے اور گوتم کے بجائے۔ ہم اور تم جنم لیتے ہیں، اس نے سوچا خیر یہ بھی ایک فلسفہ ہے اور اس کو سمجھنے کے لئے سر کھپانے کی ضرورت ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ پھیلے ہوئے ہاتھ کس قسم کے منجمد سوال ہیں۔

اسے یاد آیا کہ ایک مرتبہ اس نے یونیورسٹی کے ایک ڈرامے میں بھکاری کا رول ادا کیا تھا۔ اس نے ذہن پر زور ڈالا کہ شاید اس یاد سے کوئی کام کی بات پیدا ہو۔ اس نے یاد کیا کہ بھکاری کے مکالمے ادا کرتے وقت اسے کافی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا بھکاری کہنا چاہتا تھا کہ "بابا اللہ کے نام پر کچھ خیرات دو جمعرات کا دن ہے۔" اس کے بعد ایک خاص پوز سے منہ بنا کر کاسہ آگے بڑھانا تھا۔ اسے یاد آیا کہ اپنا پارٹ ادا کرتے ہوئے اس سے عجیب مسخرہ پن سرزد ہوا تھا۔ وہ میک اپ روم میں اطمینان سے کھڑا سگرٹ پی رہا تھا۔ کہ اچانک اس کا پارٹ آگیا وہ بوکھلاہٹ میں سگرٹ پیتا ہوا اسٹیج پر آگیا۔ اور عجیب سی سپاٹ آواز میں بولا ۔۔۔

"بابا اللہ کے نام پر خیرات! جمعرات کا دن ہے ۔۔!" یہ کہہ کر اس نے ٹھاٹ سے سگرٹ کا کش لیا۔

اس کے مقابل نے گھور کر اسے دیکھا اور دھیرے سے کہا "ابے سگرٹ تو پھینک دے!

اس نے کاسہ پیچھے ہٹا لیا اور بڑی شان سے بولا۔ "خیرات نہیں دیتا تو نہ دے سگرٹ تو پینے دے بابا۔!"

بعد میں یار لوگوں نے اس کا بہت مذاق اڑایا۔

"بھئی ایسا متمول بھکاری، بھئی خوب چیز تھی، اس کے لبوں پر یہ لطیفہ یاد کر کے خود بخود مسکراہٹ آگئی۔

اس نے سوچا ان سارے پھیلے ہوئے ہاتھوں اور ساری خالی جھولیوں کی ایک ہی پکار تھی محض ایک آواز، ایک سوال۔ اور یہ سوال کیسا تھا۔ ایسا بھی نہیں ہوا کہ کوئی شخص ہاتھ ملانے کے لئے ہاتھ پھیلائے کھڑا ہو۔ یہ پھیلے ہوئے ہاتھ اور یہ آگے بڑھے ہوئے کاسے پوری بندر روڈ پر چھائے ہوئے ہیں، ان کاسوں سے کوئی کہاں تک بچ سکتا ہے۔ آپ ایک قدم آگے بڑھائیے یہ قدم آگے بڑھ کر آپ کو گھیر لیں گے۔ آپ کچھ پیسے ڈالئے اور پیٹ بھر کے دعائیں سمیٹئے۔ باقی سے معذرت کر لیجئے۔ اور اس کے لئے ایک نہایت مختصر لیکن بہت ہی معقول سا جملہ یہ ہے کہ "بابا معاف کرو۔" یہ وہ طلسم ہے جس سے کہ کاسوں کی دیوار کائی کی طرح کٹتی چلی جاتی ہے اور آدمی دو چار کی دعائیں سمیٹتا اور دو چار کو سلام کرتا تیزی سے آگے بڑھ جاتا ہے، دانا اور عقلمند بھکاری عموماً قیافہ شناسی کے ماہر ہوتے ہیں اور وہ عموماً شکل سے اندازہ لگا لیتے ہیں کہ کون کتنے پانی میں ہے اور اس میں کہاں تک کاسے کو خالی لوٹانے اور کہاں تک بابا معاف کرنے کا طلسم دہرانے کی تاب ہے۔ اسے ان سب باتوں کا تجربہ تھا۔ اس کے ذہن کے چوکھٹے میں سے بے شمار تصویریں جھلملائیں۔ اسی وقت بیگم صاحبہ نے ساری کا پلو سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

"آپ نے تقریر تو لکھ لی ہے نا۔؟"

اس کے خیالوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اس نے پھیلے ہوئے ہاتھوں کی گرفت سے نکل کر بیگم صاحبہ کو ایک نظر دیکھا اور جواب دیا۔

"ہاں۔ تقریر تو تیار ہے۔ مسودہ جیب میں موجود ہے۔"

اسے یاد آیا کہ وہ اپنی بیگم کے ساتھ ایک کالج کا سنگ بنیاد رکھنے آیا ہے۔ اور اس سلسلے میں اسے وہاں ایک زوردار تقریر داغنی ہے۔ کار روشن سڑک پر تیزی کے ساتھ دوڑتی جارہی تھی۔ ڈرائیور ہونٹ بھینچے ونڈ اسکرین پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ بیگم صاحبہ جوڑے میں لگے ہوئے گلاب کو درست کرنے لگیں۔

اس نے سوچا کہ تھوڑی دیر کے بعد وہ کالج کا سنگ بنیاد رکھ رہا ہوگا۔ اور اس موقع پر اسے تقریر کرنی ہوگی اور اس تقریر میں اسے کالج کی مینجنگ کمیٹی کو اپنی جانب سے ایک خطیر رقم کا عطیہ دینے کا اعلان اور حکومت سے باقاعدہ مالی مدد دلانے کا وعدہ بھی کرنا ہوگا۔ پھر اس نے دل ہی دل میں کالج کی انتظامیہ کی ذہانت کا اعتراف کیا۔ اس نے سوچا۔ دراصل یہ انتظامیہ والے بڑے

"دوراندیش" ہیں وہ ان کے ذہن رسا کا قائل ہو گیا اس نے دل میں کہا کہ سنگِ بنیاد اور جلسہ تقسیم انعامات اور اس قسم کی دیگر تقریبات میں بڑے لوگوں اور بڑے افسروں کو دعوت دینا بڑا معنی خیز ہے۔ خیر چونکہ درس و تدریس بہرحال ایک باوقار اور معزز قومی خدمت ہے لہٰذا وہ ہر طریقے سے اسکی ہمت افزائی کے لئے تیار تھا۔ وہ اس خیال سے بھی خوش ہوا کہ اسکی بیگم بھی۔

اپنی جانب سے کالج کے کچھ نمایاں طالب علموں کے لئے چند گرانقدر وظائف کا اعلان کرنے والی تھیں۔ اسے یہ سوچکر بڑا فخر محسوس ہوا کہ اسکی بیگم میں دوسرے افسروں کی بیگمات کے برعکس کچھ کام کرنے کی لگن تھی ورنہ دیگر سرکاری بیگمات کا مصرف ان تقریبات میں سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہوتا کہ وہ اپنے شوہروں کی اوٹ پٹانگ تقریروں پر بے تحاشہ تالیاں بجاتی رہیں یا وقتاً فوقتاً میزبانوں کے سامنے مسکراہٹوں کے پھول بکھیرتی رہیں۔ اس نے ٹائی کو درست کیا۔ اور سگرٹ بجھاتے ہوئے سوچا کہ کسی تعلیمی، ادارے کا سنگ بنیاد رکھنا واقعی کتنی بڑی قومی خدمت ہے۔ اس نے کلائی گھما کے گھڑی دیکھی سات بجے تھے۔ ساڑھے سات تقریب کے آغاز کا وقت تھا اس نے سوچا کہ کالج میں اس کا اور اسکی بیگم کا بیچینی کے ساتھ انتظار ہو رہا ہوگا۔ بیگم نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے ہم ٹھیک وقت پر پہنچیں گے کیوں؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

سنہرے رنگ کی لمبی سی ایمپالا جیپر آگے سبز پرچم لہرا رہا تھا۔ جب روشنیوں سے سجے ہوئے پنڈال میں داخل ہوئی۔ تو ایکدم ہر طرف شور مچ گیا۔ زور، زور سے بینڈ بجنے لگا اور استقبالیہ دھنیں بجائی جانے لگیں۔ روشنی سے جگمگ کرتے پنڈال کے چاروں طرف درختوں اور جھاڑیوں میں رنگ برنگے قمقمے جل بجھ رہے تھے۔ سنہری گاڑی رنگین جھنڈیوں سے سجے ہوئے نمائشی گیٹ کے سامنے جا کے رک گئی جہاں روشن حروف میں خوش آمدید لکھا تھا۔ باوردی ڈرائیور نے جلدی سے اتر کے نہایت ادب سے کار کا دروازہ کھولا پہلے بیگم صاحبہ ساری کا پلو سمیٹتی اور حسب معمول تبسم کی بجلیاں گراتی اتریں، اسکے بعد وہ خود کار سے باہر نکلا، استقبالیہ کے ارکان، جو دروازے پر پھولوں کے ہار لئے کھڑے تھے۔ لپک کے ان کے نزدیک پہنچے اور دوسرے ہی لمحے دونوں کی گردنیں پھولوں میں چھپ گئیں۔ پھر دو ننھی منی معصوم بچیوں نے

آگے بڑھ کر اسے اور اسکی بیگم کو گلدستے پیش کئے۔ اس نے مجلس انتظامیہ کے ارکان سے مصافحہ کیا۔ فوٹوگرافروں نے آگے بڑھ کے فلیش لائٹیں چمکانا شروع کیں اور پھر ان دونوں نے نمائشی گیٹ کے اندر قدم رکھا۔ باہر کے گیٹ سے اندر تک جہاں معزز مہمانوں کی نشستیں تھیں سرخ قالین بچھا ہوا تھا۔ راستے کے دونوں جانب خوبصورت نازک اندام لڑکیاں دو رویہ قطاروں میں۔ ہاتھوں میں پھولوں کی ٹوکریاں لئے کھڑی تھیں۔ ان کے آگے آگے پھولوں کی پتیاں بکھیرتی جاتی تھیں۔ وہ اپنی بیگم کو ساتھ لے کر سرخ قالین پر متوازن قدم رکھتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ جو خواتین و حضرات پنڈال میں اپنی اپنی نشستوں پر تشریف رکھتے تھے تعظیماً اٹھ کھڑے ہوئے، وہ کیمروں کی فلیش لائٹس میں ہاتھ ہلاتا ہوا آگے بڑھا۔ بیگم اس کے پہلو میں تھیں اور ان کا نصف چہرہ پھولوں کے ہاروں میں چھپ گیا تھا۔ ابھی وہ آدھے راستے میں ہی تھے کہ سامنے سے کالج کے انتظامیہ کے صدر جو ان کے اصل میزبان تھے سیاہ سوٹ پہنے اور اسی رنگ کی فیلٹ لگائے ان کے استقبال کو لپکے۔ قریب آنے پر یکایک انھوں نے تعظیماً اپنی فیلٹ اتاری اور نصف خم ہو کر ان کا خیر مقدم کیا۔ فیلٹ ان کے ایک ہاتھ میں تھی اور اس طرح کہ اس کا اندرونی حصہ اوپر تھا۔ انھوں نے ایک ہاتھ سے بیگم صاحبہ کو سہارا دیا اور دوسرے ہاتھ میں تھمی ہوئی فلیٹ کے اشارے سے خوش آمدید کہا۔

اس نے ایک نگاہ اپنے گنجے میزبان کی جانب دیکھا۔ ان کے مسکراتے ہوئے ہونٹوں پر نظر ڈالی اور ٹھٹھک گیا فیلٹ کا اندرونی حصہ اسکی نظروں کے سامنے بڑے عجیب انداز سے ابھر آیا۔

اس نے تیز تیز قدم بڑھائے اور جا کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ گلے سے ہاروں کا پلندہ اتار کے ایک طرف رکھا اور بار بار چہرے کا پسینہ خشک کرنے لگا۔

کرشن موہن

کہیں یہ بات نہ بڑھ جائے کیسی ان بن ہے
ہمارا دل تو کدورت سے پاک دامن ہے

چلن عجیب ہے دل کا عجیب دھڑکن ہے
اسی کا دوست نا ہے جو اس کا دشمن ہے

کبھی جو مولد و مسکن تھا آرزوؤں کا
فغاں کہ آج وہ دل حسرتوں کا مدفن ہے

غمِ فراق میں بھی مسکرا رہا ہوں میں
تمہاری یاد میرے دل پہ جلوہ افگن ہے

سکوتِ یاس ہے طاری اداس ہے احساس
عجیب پیار ہے تیرا، انوکھا بندھن ہے

ستم کہ انجمن ناز کے ہیں یہ انداز
زباں کو حکمِ خموشی، نظر پہ قدغن ہے

نہ اس میں کوئی پیامِ عمل نہ رنگِ خرد
فقیہہِ شہر مری شاعری سے بدظن ہے

ہے اسمیں ہندی کا رس، فارسی کی شوکت بھی
عجیب رنگ لئے شعرِ کرشن موہن ہے

عملِ تغیّر اور دانشور

سیّد مطلبی آفریدی

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ دنیا میں سیاسی و سماجی تغیرات ہمیشہ انسانی ضروریات سے وابستہ رہے ہیں بہتر زندگی کی خواہش انسانی دلوں میں ہمیشہ موجزن رہی ہے۔ لیکن کسی ملک یا قوم کے فہمیدہ اشخاص کے متحرک ہوکر راہ عمل پیش کئے بغیر بکھرے ہوئے عوام نے کبھی ایسا موثر قدم نہیں اٹھایا جسکا نتیجہ بہتر تبدیلی کی شکل میں نکلا ہو۔

زمانہ قبل تاریخ میں جن صاحب شعور لوگوں نے عوامی ضروریات کی بنیا د پر رہنمائی کے فرائض انجام دیئے وہ مدتوں دیوتا بن کر پوجے جاتے رہے۔ اور اس کے بعد کے ادوار میں بھی دیوتا نہیں مگر بہت محترم سمجھے گئے ان کا یہ احترام درحقیقت اس رہنمائی کی وجہ سے تھا اور ہے جو انھوں نے تبدیلی کے ایک خاص دور میں انجام دی۔

گزشتہ صدیوں میں نسل انسان اس درجہ باہوش ہوچکی ہے کہ اسے عام طور پر دیوتاؤں کی ضرورت نہ رہی۔ چنانچہ بعض پسماندہ ملکوں میں دیوتاؤں اور پیغمبری کے احیاء کی کوششیں کی گئیں۔ مگر علم و دانش کی وسعت پذیری کے سبب ان پر تنقیدیں ہوئیں۔ رہنماؤں کو حکیم رشی یا مہاتما سے زیادہ مرتبہ نہ دیا گیا۔ اور وہ اس تقدس کو حاصل نہ کرسکے جسکا ہزار سال قبل عمل و دخل تھا۔

ان برگزیدہ شخصیتوں کی انگلیاں بھی اگرچہ انسانیت کی نبض پر تھیں۔ لیکن یہ وہ دور تھا کہ معاشرے میں قبائلی اور جاگیرداری سماج ختم ہوکر غیر ملکی سرمایہ داروں کے تحت جاگیرداری کی باقیات بن کر رہ گیا تھا۔ اور وہ سماج بالکل ختم ہوچکا تھا جو اوتاروں کو جنم دیتا تھا۔

پسماندہ ملکوں کی غیر ملکی لوٹ ایک اور تبدیلی پیدا کرنے کا سبب بنی۔ مختلف ملکوں میں آزادی کی تحریکات ابھریں۔ ان تحریکوں کے رہنماؤں کے نام بھی دیر تک یاد رکھے جائیں گے۔

مغربی ملکوں میں سامراجی تغیرات دو ایسے بھونچالوں کی صورت میں آئے جنھوں نے تمام دنیا کو ہلا ڈالا۔ ان میں پہلا انقلاب فرانس تھا جس نے جاگیرشاہی۔ اور جاگیرداری سماج کی جڑیں اکھاڑ پھینکیں۔ اور ترقی پذیر سرمایہ دارانہ سماج کے لئے راستہ صاف کردیا۔ اس انقلاب کے لئے جس ذہنی تبدیلی کی ضرورت تھی اسے والٹیر، روسو، شیکسپیر، ملٹن، اردن، مورلیس جیسے اس دور کے دانشوروں نے انجام دیا۔ دوسرا بھونچال اشتراکی انقلاب تھا جس نے سرمایہ داری پر ایسی فیصلہ کن چوٹ لگائی کہ وہ ترقی و اقبال کی بلند چوٹی سے لڑکھڑا کر ذلت کے تحت الثریٰ میں اترا چلا جا رہا ہے۔

روس کا یہ انقلاب سرمایہ داری سماج کے خاتمے اور اس کی جگہ اشتراکی سماج کے قیام کا اعلان تھا۔ اس انقلاب کے نتیجے میں شخصی حکمرانوں اور سرمایہ داروں کے مختصر اقلیتی طبقے کے ہاتھ سے اقتدار چھین کر مزدور کسان اور دوسرے غریب پیشہ ور دوں کی عظیم اکثریت کی پنچایت کے قبضے میں آگیا جسے سویت روس کہتے ہیں۔ اس نے عوام کے استحصال کو ناممکن بنا کر ایک عالمی برادری کی بنیا د رکھدی ہے۔ جس ذہنی تبدیلی نے اس سماجی تغیر کی طرف رہنمائی کی ہے وہ اپنے دور کے عظیم دانشور معماروں، کارل مارکس اور فریڈرک اینگلز کا مرہون منت ہے۔ ان معماروں کے لئے ذہنی سازوسامان یورپ کے مذکورہ اہل دانش جمع کرگئے تھے۔ جسے جوڑ کر انھوں نے سائنٹفک سوشلزم کی بنیا د رکھی۔ اور جن کی تعلیمات نے لینن اور ماؤزے تنگ جیسے عظیم المثال مفکر۔ عوام کو منظم کرنے والے معلم اور انتھک کارکنوں کو دنیا کے عظیم رہنماؤں کی صف میں بلند مرتبہ پر پہنچا دیا۔ غرض دیئے سے دیا یوں ہی جلتا رہا ہے۔

آج دنیا جس دور سے گزر رہی ہے۔ وہ ایک زبردست ہیجان کا دور ہے۔ انقلاب روس نے پشکن چیخوف اور گورکی کی جلائی ہوئی شمع کی روشنی میں سرمایہ داروں کے جادو کے قلعے میں جو رخنہ ڈالا تھا۔ وہ ایک اشتراکی ملک روس سے بڑھ کر یورپ اور ایشیا ر کے کئی ملکوں اور براعظم امریکہ کے ایک جزیرے کیوبا تک میں پہنچ کر وسیع ہوگیا ہے اور سامراجیت جو تمام عالم پر چھائی ہوئی تھی سمٹی جارہی ہے۔ ایشیاء اور افریقہ کے بہت سے ملکوں کے آزاد ہونے سے برطانیہ اور دوسرے یورپ کے سامراجی ملک اپنے ملکوں میں محصور ہوتے جارہے ہیں۔ ان کی سرمایہ دارانہ توقعات امریکی سامراج سے وابستہ ہوکر رہ گئی ہیں۔ اگرچہ ان کے باہمی تضاد بھی ابھر رہے ہیں۔ امریکی سامراج دنیا کے کمزور نو آزاد اور پسماندہ ملکوں کے استحصال ادارہ کا گڑھ بن کر ان سب ملکوں کو اپنی گرفت میں رکھنے کے لئے جان توڑ کر کوششیں کر رہا ہے۔ جو یورپ کے پرانے سامراجیوں کی گرفت سے آزاد ہوئے ہیں۔ ان ملکوں کے عوام اسکی گرفت سے آزاد رہنے اور اپنے پیروں پر کھڑے ہونے اور ملک کی اقتصادی آزادی کے قائم رکھنے کے لئے اس سے مصروف پیکار ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سامراج آج ایشیاء افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ملکوں اور اشتراکی ملکوں کے گھیرے میں ہے اور سامراجیت کی بقا کی آخری جنگ ہو رہی ہے۔

یہ سب کچھ اس دور تغیر کی وجہ سے ہو رہا ہے جو عالمی سرمایہ داری کی موت اور عالمی اشتراکیت کے قیام پر جاکر ختم ہونے والا ہے۔ اس عالمی ہیجان کا خاتمہ پس ماندہ نو آزاد ملکوں کے عوام میں سیاسی شعور پیدا ہوئے بغیر نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ ہر ملک کے عوام کا استحصال کرنے والا مختصر گروہ نہ صرف یہ کہ اپنے عوام کا خود استحصال کرتا ہے بلکہ وہ سامراجی ملکوں کے اجارہ دار سرمایہ داروں کو اپنا حلیف بنائے رکھنے کے لئے ان کو بھی استحصال کرنے کے مواقع فراہم کرتا ہے اس استحصال سے محفوظ رکھنے کے لئے بھی لازمی ہے کہ ملک کے عوام میں جاگیرتی پھیلے اور ان کا شعور اس حد تک بلند ہو کہ وہ اپنے اجتماعی مفاد کے لئے منظم ہوکر اپنے مفادات کا تحفظ کرسکیں۔

ملک کے اہل دانش کا فرض ہے کہ وہ اس کرب و اذیت کے ہیجانی دور تغیر کو ختم کرنے کے لئے آگے بڑھ کر وہی فریضہ انجام دیں جو ہر دور تغیر میں ان ادوار کے فہمیدہ لوگوں اور دانشوروں نے انجام دے کر اپنے کو امر بنالیا ہے۔ ہر صاحب عقل کی عقل و دانش انفرادی یا ذاتی اعجاز کا کرشمہ نہیں ہوتی وہ مختلف مواقع اور اردگرد کے ماحول کا فیض ہوتی ہے۔ اس لئے فہم و دانش کو نجی استفادے کے لئے مخصوص کرنا یا سمجھنا انتہائی خود غرضی اور احسان فراموشی ہے کسی پاگل دیوانے کا پتھر مارنا قابل معافی جرم قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن کسی فرزانے کا اپنی عقل و دانش کو محض اپنے جسم و جان کی لذت یا آرام کے لئے محدود کر لینا ایسا شرمناک جرم ہے کہ انسانیت اسے کبھی معاف نہیں کرسکتی۔ کیونکہ بقول مولانا رومؒ ؂

گندم از گندم بروید جو ز جو
از مکافات عمل غافل مشو

گندم سے گندم پیدا ہوتا ہے جو سے جو۔ کرنی کے پھل سے غافل نہ ہو۔

گندم اور جو کی طرح خود غرضی بھی خود غرضی کو جنم دیتی ہے۔ اور جب کسی ملک کے دانشور خود غرض بن جائیں۔ ان کی ذہانت و ذکاوت محض آسائش جسم و جان کے لئے مقید ہوکر رہ جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے عوام کی رہنمائی ان میں جاگیرتی لانے یا

شعور بڑھانے کے لئے نہیں کر رہے ہیں بلکہ جہالت بڑھانے اور خود غرضی پھیلانے کے لئے کر رہے ہیں۔ ابن عام، خود غرضی کا درناک انجام دیکھنے کے لئے ہمیں بہت دور جانے کی ضرورت نہیں۔ ہندوستان اور مشرق کے ممالک کی پچھلی تاریخ کا ہر ورق نقش فریادی بن کر کہہ رہا ہے۔

دیکھو مجھے جو دیدہ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے

پاکستان کو آزاد ملک بنے آج اٹھارہ سال ہو رہے ہیں۔ یہاں جو کچھ ہوتا رہا ہے۔ وہ قابل افسوس سے زیادہ قابل فکر ہے۔ خود غرضی طوفان برق و باد بن کر ان تمام اقدار کو جو اس دنیا کے ہر دور میں محترم سمجھی جاتی رہی ہیں بہائے لئے جا رہا ہے۔ یہ وہ طوفان ہے جو قوموں کی جڑیں اکھاڑ کر انھیں صفحہ ہستی سے مٹا دیتا ہے۔ اور ایسی ظلمت طاری کر دیتا ہے جو انھیں کتنی ہی نسلوں تک اندھا بنائے رکھتی ہے۔ اس طوفان کا مقابلہ توپ و تفنگ، شمشیر و سناں سے کبھی نہیں کیا گیا۔ اور نہ آج میزائل اور ایٹم بم سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ نہ جرنیلوں اور کرنیلوں نے کبھی اس کا مقابلہ کیا اور نہ کسی سہگل اور دھاون نے، اس کا مقابلہ ہمیشہ دانشوروں کے دل و دماغ اور قلم نے کیا ہے۔ چنانچہ بہت دیر سے پاکستان کے حالات دانشوروں کو للکار رہے ہیں۔ اور صلائے عام دے رہے ہیں کہ

کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق

مگر افسوس کہ اس صلائے عام کا ہمارے اکثر و بیشتر دانشوروں کی طرف سے جواب مایوس کن اور حوصلہ شکن خاموشی سے دیا جاتا رہا ہے وہ خود اس تند جھکڑ کے سامنے پیپل کے خشک پتوں کی طرح اڑ کر عشرت کدوں، کافی ہاؤسوں، سرکاری اور غیر سرکاری دفتروں میں جمع دکھائی دیتے ہیں فرض شناسی سے بے نیاز عشرت امروز میں مگن، عشرت فردا کے طلب گار، طرح طرح سے یا پیٹتے، قہقہے مارتے نئی عورتوں کا ذکر کرتے اور اجنبی اشتہا کو بھڑکانے میں مصروف ہیں یا ان کے قلم ذلیل، جاسوسی، رومانی اور گندے عشقیہ ناولوں کی غلاظت اگل رہے ہیں سیاسی اور سماجی تغیرات اور ان کے اثرات سے بے نیاز اپنے شہر اپنے ضلع اپنے گاؤں اور اپنے ملک کے مسائل سے بے تعلق اس مدہوش کی طرح ہیں جس کی صرف روپے کی جھنکار سے آنکھ کھلتی ہے۔ اس مکڑی کی طرح ہیں جو ہر وقت محض اپنی ذات کے لئے جالا تنتی رہتی ہے اور جو بھنگا اس میں پھنسے اسے نگل جانے کیلئے بے قرار رہتی ہے۔ ان کا پیٹ عام کسان اور محنت کش مزدور کے مقابلہ میں بڑھ کر اتنا پھیل گیا ہے کہ اگر اس میں پڑوسیوں کی جائیں، آبرو، دھن دولت ساز و سامان موٹریں اور ریفریجریٹر سب بھر دیئے جائیں تب بھی وہ نہیں بھرتا۔ کاش وہ سمجھتے کہ جس ملک کے آب و خاک سے ان کی وجود ظہور میں آئے ہیں اس کے عوام کی سربلندی کے بغیر انکی حیثیت اس بلبلے سے زیادہ نہیں ہے جس کا نشان تک ایک لمحہ تک نہیں رہتا۔

فیروز نظر

اجنبی شہر

(کراچی کی رنگینیوں کے نام)

اف یہ سینوں پہ مچلتے ہوئے آنچل اے دوست
ہائے یہ دوش پہ لہرائی ہوئی زلف سیاہ
یہ مہکتے ہوئے ملبوس یہ دلکش چہرے
گم نہ ہو جائے نظاروں میں کہیں ذوق نگاہ

یہ دل آویز تبسم یہ اداؤں کا ہجوم ——!
دل دھڑکنے کی بھی آواز نہیں ہے اے دوست
یہ فضاؤں میں تعطر، یہ ہواؤں میں سرور
اجنبی شہر کی ہر چیز حسیں ہے اے دوست

ہر قدم پر یہ نگاہوں کے تصادم کا سماں
جیسے مے خانے میں ٹکرائے کوئی جام سے جام
کتنے مسرور نظر آتے ہیں انسان یہاں
کتنے پر کیف گزرتے ہیں یہاں صبح و شام

محو حیرت ہوں کہیں خواب کا عالم تو نہیں
ہر قدم پر مجھے جنت کا گماں ہوتا ہے
کتنے دلچسپ ہیں اس شہر کے رہنے والے
غم بھی دیتے ہیں تو راحت کا گماں ہوتا ہے

سوچتا ہوں یہاں سب کچھ سہی لیکن اے دوست
کوئی ہمدم، کوئی غمخوار یہاں ہے کہ نہیں
یہاں شیریں بھی ہے، فرہاد بھی، پرویز بھی ہے
قدر فن، عزت فنکار یہاں ہے کہ نہیں

جانے کیوں مجھ کو یہ محسوس یہاں ہوتا ہے
اجنبی راہیں مجھے گھور رہی ہیں ایسے
مل سکے گا نہ یہاں بھی دل مضطر کو سکوں!
یہ فضا بھی مجھے راس آ نہ سکے گی جیسے

ایم کوٹھیاوی راہی

انداز مسیحائی

بال روم رنگ برنگی روشنیوں میں ڈوبا ہوا ہے آرکسٹرا کی مست دھنوں میں بہت سے پیکر متحرک رہے ہیں ـــ میں رم کی ایک پوری بوتل حلق میں انڈیل چکا ہوں۔ سدھا میری ہم رقص ہے۔ وہ کبھی بہت حسین تھی۔ مگر اب اس کا حسن میک اپ کا مرہون منت ہے وہ ایک اجڑی ہوئی بہار ہے۔ بلکہ خزاں کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ لیکن اس سے میری ملاقات کا ایک سین آپ بھی دیکھئے۔

"یتیم ڈیئر"
"ہوں"
"کیا بہت نشے میں ہو"
"ہوں"
"اور میں بھی"
"کہنا کیا چاہتی ہو۔؟"
"ڈیڈی نہیں آئیں گے؟؟"
"نہیں"
"کیوں ـــ بولو ڈیئر کیوں نہیں آئیں گے۔؟"
"سورگ میں جی لگ گیا ہو گا"
"مگر کام تو انھوں نے نرگ کا کیا تھا"
"تو نرگ ہی میں جی لگ گیا ہو گا"
"نرگ میں آگ ہوتی ہے"
"مگر شعلے کہاں؟"
"دھرتی پر"
"دھرتی کے شعلوں سے تو انھیں پیار تھا"
"وہ پیار مر گیا"
"کیسے ڈیئر۔؟"
"شعلے بجھ گئے"
"میں سمجھی نہیں مجھے سمجھاؤ"
اور میں اسے سمجھانے کے لئے بال روم سے نکال لایا ہوں۔ آپ بھی پیچھے پیچھے چلے آئیے۔ یہ ایک نئی تعمیر شدہ عمارت ہے آسمان سے بات کرتی عمارت دیکھ رہے ہیں نا۔!
"یہ تو اسی کمینے کا مکان ہے"
"کس کمینے کا۔؟"
"جس نے ڈیڈی کو تباہ کیا"
"جس نے باپ کی آگ بجھائی۔ یہ بھی کہو"
"ہاں یہ بھی کہتی ہوں"
"مگر کس کے باپ کی آگ؟"
"میں۔ میں کیا جانوں"
"تمہارے ڈیڈی بے ایمان تھے"
"یہ جھوٹ ہے"
"انھوں نے چور بازاری سے اتنی دولت جمع کی۔۔۔"
"مگر وہ کمینہ۔۔۔؟"
"ان کا دوست تھا"
"دوست بن کے دھوکہ دیا"
"اور کیا بن کے دے سکتا تھا"
"میں کیا جانوں"
"میں بتاتا ہوں"
"بتاؤ"
"وہ کچھ اور بن کے دھوکہ نہیں دے سکتا تھا"
"مگر دھوکہ دینے کی ضرورت بھی کیا تھی؟"
"غریب تھا"
"غریب بے ایمان ہوتے ہیں"
"کون بناتا ہے؟"
"میں کیا جانوں"
"میں بتاتا ہوں"
"بتاؤ"
"غریب کو بے ایمان بنانے والے امیر ہوتے ہیں۔ غریب بدلے میں ان کا دیوالہ نکال دیتا ہے دیوالہ نکال کے انکے باپ کی آگ کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ٹھنڈا کر دیتا ہے۔"
"اور خود امیر بن جاتا ہے۔ ہے نا یتیم ڈیئر؟"
"ہوں"
"مگر میں غریب نہیں ہوں"
"اس لئے کہ نشے میں ہو"
"میں سچ کہتی ہوں"
"اس لئے کہ کلب سے آ رہی ہو"
"میں یقین دلاتی ہوں"
"اس لئے کہ عورت ہو"
"میں عورت نہیں ہوں"
"اور کیا ہو"
"لڑکی۔ کماری"
"وہ کیسے؟"
"میری شادی نہیں ہوئی"
"اس لئے کہ امیر ہو۔؟"
"ہوں"
"اس لئے کہ رم پیتی ہو"
"ہوں"
"اس لئے کہ کلب جاتی ہو"
"ہوں"
"اور شاید اس لئے بھی کہ ابھی تک کماری کنواری ہو کہ۔۔۔کہ۔۔"
"کہو۔ رک کیوں گئے۔؟"
"برا لگ جائے گا"
"نہیں کہو"
"میک اپ اچھا کر لیتی ہو"
"کیا مطلب؟"
"ہم ہی لوگ تاڑ سکتے ہیں کہ پھول مرجھا چکے ہیں۔ پھول جل چکے ہیں۔ اور پھر بھی بہار کو خزاں جان کر خریدنے والے کلب میں مل جاتے ہیں۔ بکثرت۔۔۔۔"
"بس اب زبان کو لگام دو۔ نہیں تو نہیں تو"
"کیا کر لو گی۔؟"
"میں بھی چلی جاؤنگی"
"کہاں؟"
"جہاں ڈیڈی گئے"
"چلی جاؤ تو بہتر ہے"
"کیا۔"

"خس کم جہاں پاک۔"
"سمجھی نہیں۔"
"تمہارا یہ وجود تمہارے مرے ہوئے ڈیڈی کی آتما کو بھلا نہیں لگتا ہوگا۔ دیکھو سدھا ڈارلنگ۔! میں نشے میں ضرور ہوں۔ مگر بات پتے کی کہتا ہوں۔ ان کی آتما یہیں کہیں کھڑی دیکھ رہی ہے۔ تمہاری اور میری باتیں سن رہی ہے۔ اور سسک رہی ہے اور پچھتا رہی ہے کہ تباہ ہونے کے بعد انھوں نے پہلے کیوں خود کو گولی ماری۔ پچھتا رہی ہے کہ۔ پہلے کیوں نہیں تمہیں ختم کیا۔ بہتر ہے سدھا ڈارلنگ تم بھی اس دھرتی سے چلی جاؤ۔"
"تم تم۔۔۔ ٹھیک کہتے ہو پیتم ڈیئر۔ ٹھیک کہتے ہو۔ آج گھر جاتے ہی زہر پی لونگی۔"
"مگر ذرا ٹھہرو"
"اب کیا ہے؟"
"کہیں ایسا نہ ہو تمہاری آتما کو سسکنا پڑے۔"
"میری آتما نہیں سسکے گی۔"
"یہ کیسے کہتی ہو۔ میں جو بک رہا ہوں"
"کیا مطلب"
"تمہاری۔ تمہارے ڈیڈی کی، تمہارے ڈیڈی کی بے ایمانی اور دغابازیوں کی ساری کہانیاں۔ میرے سینے میں دھڑک رہی ہیں۔۔۔"
"تو کیا ہوگا۔"
"بہت کچھ ڈارلنگ۔"
"مگر تم۔ تم تو بڑے نیک ہو ڈیئر۔"
"میری نیکی بھی دکھاوے کی ہے۔"
"تم سے مجھے ایسی امید نہیں۔"
"مر کے تو دیکھو۔"
"میں ٹھٹھا مار کے ہنس رہا ہوں۔ سدھا کی نشے میں ڈوبی آنکھیں بھیگ گئی ہیں۔ اس نے میرے کوٹ کا کالر پکڑ لیا ہے۔ اور مجھے جھنجوڑ جھنجوڑ کے کہہ رہی ہے۔
"میں نہ جیوں۔ نہ مروں۔ نہ ہنسوں۔ نہ روؤں تو کیا کروں۔ بولو۔ بولو پیتم میں کیا کروں۔"
"اپنے ڈیڈی کی آتما سے پوچھو۔"
"وہ کدھر ہے؟"
"ادھر"
"کدھر"
"ادھر"!
وہ ادھر ادھر دیکھ رہی ہے اور پوچھ رہی ہے۔ اور میں اشارے پر اشارے کئے جا رہا ہوں مگر آپ کو نہیں پہچانتی۔ نہیں دیکھ پاتی۔ اس لئے کہ آپ کا پیکر جل چکا ہے۔ دھرتی کے شعلے آپ کے بدن کو راکھ کر چکے ہیں۔ آپ ایک آوارہ روح ہیں۔ جسے صرف میں دیکھ رہا ہوں۔
"کس سوچ میں ہو پیتم ڈیئر۔"
"اوں۔"
"اونچی اونچی دیواروں میں کیا دیکھ رہے ہو؟"
"تمہارے ڈیڈی کی سسکتی آتما۔"
"وہ تو دیواریں ہیں۔"
"ہاں دیواریں۔"
"آتما کہاں۔"
"انھی دیواروں میں"
"بہت نشے میں ہو۔"
"ہاں بہت۔"
"چلو اب چلیں۔"
"کہاں؟"
"کہیں بھی"
"موڈ نہیں ہے۔"
"کاہے کا موڈ"
"تمہارے ڈیڈی کا۔"
"ڈیڈی کا موڈ تو مر چکا ان کے مرتے ہی۔"
"ہاں مر چکا۔ مگر کبھی کبھی جی بھی اٹھتا ہے۔"
"کہاں۔؟"
"کبھی میرے دل میں کبھی ساہوکار کے دل میں۔"
"سمجھی نہیں"
"خوب سمجھتی ہو۔ خوب جانتی ہو۔ مگر سدھا ڈارلنگ! چہرہ ایک دن میک اپ کے لائق بھی نہیں رہ جائے گا۔ ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ یہ بدن چلتا پھرتا ہڈیوں کا ڈھانچہ نظر آئے گا۔ تب تمہارے ڈیڈی کا موڈ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مر جائے گا۔ کسی کے من میں نہیں جنم پائے گا۔ اب سمجھ رہی ہو کہ نہیں؟"
"سمجھ رہی ہوں۔ سمجھ رہی ہوں۔ مگر کیا کروں۔ کیا کروں۔ پیتم ڈیئر۔"
"ایک کام۔"
"کونسا کام"
"چلو بتاتا ہوں۔"
اور اب میں اسے اس فلک بوس عمارت کے آگے غریبوں کی بستی میں جہاں ظلمتیں جلتی ہیں۔ لے جا رہا ہوں۔ آپ بھی چلئے۔ آیئے۔
"یہاں تو بڑا اندھیرا ہے۔"!
"ہاں بڑا اندھیرا ہے"!!
"اور بدبو بھی بہت"
"میرا دم گھٹتا جا رہا ہے یہاں تو"
"پہلی بار آنے سے"
"لوٹ چلو یہاں سے پیتم ڈیئر۔
"کہاں؟"
"جہاں سے لائے ہو۔
"وہ منزل اب پرائی ہے"
"اور یہ؟"
"اپنی۔"
"کس کی؟"
"میری۔"
"تم یہیں کے رہنے والے ہو؟"
"ہاں"
"اسی بستی کے؟"
"ہاں۔"
"پہلے کیوں نہیں بتایا۔؟"
"اس لئے کہ تمہیں یہیں آنا تھا۔"
"میں یہاں نہیں رک سکتی۔"
"آگے موت ہے۔ پیچھے بھی موت۔ ضرور رکوگی۔"
"نہیں نہیں کبھی نہیں۔"
"تو جاؤ۔"
"اور تم؟"
"میں کیوں جاؤں؟ میری منزل یہی ہے۔ صدیوں سے یہی۔ صدیوں سے یہی منزل ڈارلنگ۔
"کتنے گھناؤنے ماحول میں پلے ہو۔"
"ہاں۔"
"چلو چلو لوٹ چلو۔"
"کہاں کہاں"
"وہیں۔"
"تم جاؤ۔"
"پچھتاؤ گے تنہا۔"
"مگر کب تک؟"
"ہمیشہ۔"
"اب ہمیشہ کی بات نہیں۔ چند ہی مہینوں، چند ہی سالوں کی بات اور ہے۔ جب اسی طرح اسی سمے کوئی لڑکھڑاتا ہوا ڈھانچہ گرتا پڑتا۔ اس گھناؤنی بستی میں آئے گا۔ اسی گلی۔ اسی دہلیز پر اور دستک دے گا۔ اور آواز پہ آواز دیگا۔ اور میں دیکھ رہا ہونگا۔ اسی طرح بالکل یونہی۔ پاس سے بہت پاس سے۔ ہنستے ہوئے۔۔۔"
"کس ڈھانچے کی بات کرنے لگے۔؟"
"اسی ڈھانچے کی جو ابھی پورے طور پر ڈھانچہ نہیں ہے۔ اسی چہرہ کی۔ اسی بدن کی اسی تمہارے بدن کی بات سدھا ڈارلنگ۔"
وہ تلملا سی گئی ہے۔ کپکپا سی گئی ہے۔ جیسے میں نے جو کہا اس کا یقین نہ ہو۔۔۔ اور مجھ سے لپٹ گئی ہے اور سسک سسک کر رو رہی ہے۔۔۔۔ اب یہ اسی طرح سسکتی رہے گی۔ روتی رہے گی۔ آپ کب تک یہ سین دیکھیں گے کنارے کھڑے کھڑے۔ جایئے اور مجھے اس کے آنسو پونچھنے دیجئے۔ اور یقین مانیے اب یہ کہیں نہیں جائے گی۔ یہیں رہے گی۔ آپ تو جانتے ہی ہیں۔ کتنے ٹوٹے تارے ظلمتوں کی اس مہربان بستی میں پناہ پائے ہوئے ہیں۔ ●



بے وقوف عاقلوں سے اتنا نہیں سیکھتے جتنا عاقل بے وقوفوں سے سبق حاصل کرتے ہیں۔ — کے، ٹو

سنہرا زمانہ ہمارے سامنے ہے نہ کہ ہمارے پیچھے — رسکن

شاعر دکھوں سے سیکھتے ہیں اور گیتوں سے سکھاتے ہیں — شیلے

نرم اور صلح کن الفاظ نہایت طاقتور ہوتے ہیں — گلیڈن

اپنی خوشی کے لئے دوسرے کی مسرت کو خاک میں نہ ملاؤ — رینالڈ

کتنی افسوسناک بات ہے کہ انسان کے سب سے حسین جذبات بھی پیسہ سے وابستہ ہیں — بالزاک

سرمایہ داری نوع انساں کی پیٹھ میں زہر کا ایک پھوڑا ہے اس پھوڑے کو کاٹ کر پھینک دو ورنہ تمام جسم میں یہ زہر سرایت کر جائے گا اور جسم کو تباہ کر ڈالے گا۔ — لینن

مطالعہ سے خلوت میں خوشی تقریر میں زیبائش، تجویز و ترتیب میں استعداد، اور تجربہ میں وسعت ہوتی ہے — بیکن

مجھے تو مزدوروں کا خون چوسنے والے سرمایہ داروں کی نسبت مردم خور وحشی اور درندوں میں ہزار گنا زیادہ انسانیت، مروت، اور رحم دلی کے آثار نظر آتے ہیں، کیونکہ وہ تو ایک دفعہ چیر پھاڑ کے کھا لیتے ہیں۔ لیکن سرمایہ دار تو زندگی بھر مزدوروں کا خون چوستے رہتے اور انکی نسلوں کی نسلیں تباہ کر ڈالتے ہیں اور مزہ یہ ہے کہ کسی کو معلوم بھی نہیں ہونے دیتے — لوئیس

اگر بہ نظر غور دیکھا جائے تو دنیا میں تمام گناہوں، تمام برائیوں اور تمام جرائم کا سرچشمہ عدم مساوات ہے جب انسان مساوی طریقے پر پیدا ہوتے ہیں اور مرنے کے بعد بھی مساوی ہو جاتے ہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ درمیانی وقفہ یعنی زندگانی کے دن بھی مساویانہ طریقہ پر کیوں نہ گزاریں۔ — وکٹر ھیوگو

دنیا کا سب سے بڑا اور بدترین گناہ افلاس ہے، زنا کاری، قتل، غبن، ڈاکہ زنی، رشوت خوری، چوری، شراب خوری اور جوا، یہ تمام گناہ افلاس کے مقابلے میں مجسم نیکیاں ہیں۔ — برناڈ شا

میں مظلوم مزدوروں اور غربا کے طبقے کے ساتھ دوزخ میں جانا زیادہ پسند کروں گا بہ نسبت اس بہشت کے جس میں سرمایہ دار ظالم امرائے بے فیض شامل ہو — ھیرن

بھوک سے مرنے کی بہ نسبت تلوار سے مرنا ہزار درجہ بہتر ہے — السپ

انسانی سوسائٹی کا سب سے بڑا عجوبہ یہ ہے کہ غریبوں نے اتنا طویل عرصہ دنیا کی بے انصافی اور عدم مساوات کو خاموشی سے کیسے برداشت کر لیا — افرو ڈر

سماج زندہ انسانوں کا وہ مجموعہ ہے جو ایک مخصوص معاشی اور سیاسی نظام کے دائرے میں آباد رہا ہے۔ اور زمان و مکان کے قیود میں اسیر ہے۔ — سردار جعفری

جدوجہد نہ کرنا محتاجی کا باعث ہوتا ہے۔ — لقمان

ماضی کی لگام ہمارے ہاتھ میں ہے۔ لیکن ہماری لگام ماضی کے ہاتھ میں نہیں — مارکس

کبھی کوئی چیز ختم نہیں ہوتی۔ کسی دوسری چیز میں تبدیل ہو جاتی ہے خوبصورتی یادیں، یاد نغمہ میں، نغمہ گونج میں، گونج فضا میں فضا لہروں میں، اور لہروں کو کون مٹا سکتا ہے — کرشن چندر

تاریخ ایک دن اپنا فیصلہ دے گی۔ لیکن یہ وہ تاریخ نہیں ہوگی جو بروسلز، پیرس، واشنگٹن یا لندن میں پڑھائی جائے گی بلکہ یہ تاریخ وہ ہوگی جو ان ملکوں میں پڑھائی جائے گی جن پر سامراجیوں اور ان کے بغل بچوں نے ہلہ بول رکھا ہے — لومبا

بھوکا ننگا مزدور جب جبر اور ظلم کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا ہے تو بڑے بڑے کج کلاہوں کے تاج اس کی ٹھوکروں کی زد میں ہوتے ہیں — رسل

ادب کا مقصد محض انسانی تجربات کی کامیاب ترجمانی ہے۔ تجربات خارجی ماحول کے زیر اثر لکھنے والے کے ذہن پر منعکس ہوتے ہیں، لکھنے والے کو چاہیئے اسے من و عن بیان کر دے — فیض

مجتبیٰ صدیقی

انسان عظیم ہے

انسان کو جیسے ہی اپنا خیال آیا۔
یزداں عرش سے اتر آیا۔

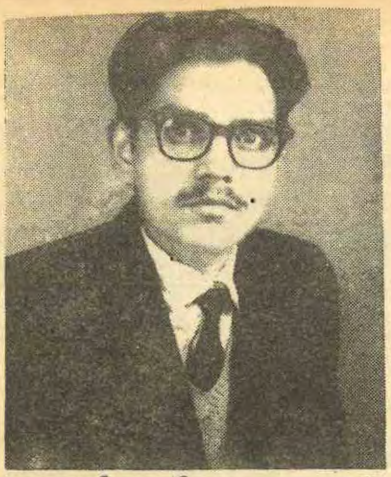
۴ر اکتوبر ۵۷ء کی ایک عظیم تاریخ ساز صبح کو سویت یونین نے ایک مصنوعی سیارے کو فضا میں بھیج کر دنیا بھر کے انسانوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا اور اب پھر ۱۸ر مارچ ۶۵ء کو سویت یونین کا ایک اور جلیل القدر فرزند اس خلائے بے پایاں میں مستانہ وار رقص کرکے زندہ و سلامت اپنی مقدس دھرتی پر واپس آگیا ہے تو خود انسانوں کی برادری آئینۂ حیرت بنی ہوئی سوچ رہی ہے کہ آخر ایک ارضی بشر نے اس نظام شمسی کے تحت گردش کرتے ہوئے بے کس و بے بس سیارے کو کیسی کیسی نظروں اور کیسے کیسے جذبات کے ساتھ دیکھا ہوگا اس خاکی رقاص نے ان تمام احتیاطی تدابیر اور عجیب و غریب محفوظ ترین لباس کے ساتھ دس منٹ تک اس کائنات میں نظام شمسی کی رقاصہ سرزمین اور خود اپنا موازنہ نہ کیا ہوگا۔ اور بڑے فخر و غرور سے یہ بات سمجھ لی ہوگی کہ وہ خود اس بے کراں خلاء میں جس سمت اور جس رخ میں چاہے رقص کرنے پر مختار ہے آزاد ہے۔ مگر رقاصہ زمین تو صرف و محض ایک ہی مرکز و محور پر گردش کرتے رہنے پر مجبور و لاچار ہے۔

سویت یونین کے سائنسدانوں کا یہ کارنامہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے عظیم ہی نہیں بلکہ تاریخ کے ایک نئے باب ہونے کا بھی حامل ہے۔ اس ذرۂ خاکی سے ماہ و نجوم کا سہم جانا بالکل بجا ہے اس وقت خلا میں ذی شعور حرکات و سکنات بچشم خود دیکھنے کا یہ کامیاب تجربہ انسانی ارتقاء کی آخری سیڑھی ہے۔ آخری سے مراد یہ ہے کہ اب اس کے بعد باب فتح شروع ہوتا ہے جس سے انسان بے دھڑک گزرتا چلا جائے گا۔ بنی آدم کی عظمت اور وقار بلند تر ہوتا رہے گا۔ کائنات اور فطرت تسخیر کرلی جائے گی اور اس کے وہ تمام خواب جن میں اسے ستاروں سے آگے اور بلند جہاں دکھائی دیتے تھے اب لازماً شرمندہ تعبیر ہونگے۔

آیئے اس عظیم مخلوق کو مبارکباد دیں اور اسکی اپنی عظمت کے ترانے گائیں کہ اس نے کس طرح غاروں سے نکل کر اور درختوں سے اتر کر اس پر ہول اور وحشتناک سیارے کو جو کرۂ ارض کے نام سے مشہور ہے، نہ صرف تسخیر کیا بلکہ اسے زندہ رہنے کے لئے اس قابل بنالیا کہ اس میں اپنے آرام و آسائش کے تمام ساز و سامان فراہم کرلئے۔ مختلف چیزوں کے تصوراتی خوف و دہشت سے دل پاک کیا۔ اسکو حسین و جمیل صورت بخشی، باشعور اور متحرک ذہن ہی یہ کام کرسکتا تھا۔ وہ کسقدر عظیم ہے بیسویں صدی انسانی کرامات اور عجوبوں کی صدی ہے۔ انسان خود انگشت بدنداں ہے کہ اس نے اور اس جیسے اور دوسروں نے کس کس طرح سے اس کرہ ارض کو خوبصورت اور رنگین بنادیا ہے۔ اور وہ کائنات کے ڈھکے ہوئے ذخائر کو آشکار کررہا ہے۔ زمین کی کشش سے نکل کر اور "انسانی" حکمت کو استعمال کرکے بھلا کوئی کیونکر باہر جاسکتا ہے — کوئی فضائے بسیط کے راز ہائے سربستہ کو کیونکر دیکھ سکتا تھا۔ مگر انسان — ہاں انسان کو یہ سب کچھ کرنا تھا۔ اسی لئے بین الاقوامی ارضی طبقاتی سال کے شروع میں یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ اب انسان کو باہر کی دنیا میں بھی اپنا سکہ بٹھانا ہے۔ لہٰذا مصنوعی سیاروں کے ناقابل تصور وجود کو ہی انسانی فلاح و عظمت کے لئے ایک جیتی جاگتی حقیقت بنا کر رکھ دیا گیا۔ اور اس میں بیٹھ کر انسان کشش زمین کی تمام مقناطیسی طنابیں توڑ کر اور خلا کی تمام رکاوٹوں کو زیر قدم روندتا ہوا آگے — اور آگے ہی بڑھتا جائے۔ اپنے بنائے ہوئے پرچم کو — چاند پر بطور نشانی پھینک آئے چاند اور خود اپنی زمین کی ان گنت تصویریں کھینچ لائے تاکہ تحقیق و تجسس کا جذبہ مطمئن ہو اور کام اور آگے بڑھایا جائے —!

وہ چاند جو حسن کی علامت سمجھا جاتا تھا اور جسکا وجود خود ایک حسین خواب سے کم نہ تھا اب غیر تصوراتی طاقت کے چنگل سے باہر، ہماری اپنی دسترس میں ہوگا۔ وہ سیارے جنکی گردش و جنبش کو دل توڑ دینے والی انسانی خوشحالی، اور بدحالی، خوش قسمتی اور بدقسمتی کی پرفریب وجہ تسمیہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ اب خود ہمارے رحم و کرم پر ہونگے۔ ہمیں اب ماضی کی ان متعفن لاشوں کو پاتال میں دفنانا پڑے گا۔ جو ہر مصیبت کو ان سیاروں سے منسوب کردیا کرتی ہیں۔ اب ہمیں ہر اس چیز سے جو ہمارے دائرۂ اختیار میں نہیں ہے خوف کھانے کی بجائے قربت حاصل کرنی چاہیئے اور اسے انسان کے قبضۂ اختیار میں لانا چاہیئے۔

لیکن جس طرح مور اپنے بدنما پیروں کو دیکھ کر رو دیتا ہے اسی طرح ہماری نظریں بھی یہ دیکھتی ہیں۔ کہ انسان ذروں سے بچتے ہوئے ستاروں کی باتیں کررہا ہے۔ قطروں سے اجتناب کرتے ہوئے وسیع گہرے سمندروں کی آزاد و خود مختار سطح پر دوسرے ممالک کو غلام اور محتاج بنانے والے بحری بیڑے چلا رہا ہے روشن چاند کی طرف سفر کرتے ہوئے خود زمین کی تاریکیوں کو مٹانے کے فرض سے غفلت برت رہا ہے۔ دور دراز کے سیاروں کی تصویریں لیتے ہوئے اپنے ہی خون سے رنگے ہوئے پیراہن میں ملبوس مفلسوں اور آزادی کے طلبگاروں سے چشم پوشی کررہا ہے — حکمت و دانش کے موتی لٹاتے ہوئے ابتدائی تعلیم سے بھی محروم بچوں اور بالغوں کی توہین کررہا ہے۔ زہرہ، سیارے کے نسوانی نام میں کشش محسوس کرتے ہوئے حوا کی بیٹیوں کی، لٹتی ہوئی عصمتوں کا تماشا دیکھ رہا ہے۔ ممکن ترین بلندیوں اور رفعتوں کو نگاہوں میں رکھتے ہوئے، نسل، رنگ، قوم، مذہب، طبقہ، تہذیب اور تمدن کے منفی تعصبات اور انسان دشمن رجحانات کا نمونہ دکھائی دے رہا ہے۔ جنگی اڈوں کا قیام اور آتشیں ہتھیاروں کا انتظام امن و امان قائم کرنے کے لئے نہیں بلکہ انسان کے استحصال اور اجارہ داری کے لئے کیا جارہا ہے۔ تمام انسانوں پر چند انسانوں کے قبضے کے لئے لوٹ کھسوٹ کی مختلف شکلیں اختیار کی جارہی ہیں اور لوٹ و ظلم کی اس حرکت و عمل کے خلاف کی جانے والی تمام کوششوں کو کمزور و ناکام



بنایا جا رہا ہے۔

سائنسی ترقی کے اس روشن ترین مرحلے پر مذکورہ تمام باتوں کے برعکس ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ہمارے پاس جو بے شمار ذرائع و وسائل ہیں انھیں ہم انسانی ضروریات کی تکمیل اور ذہنی ترقی کے لئے استعمال کریں۔ اس روتی بلکتی دنیا کو سب کے لئے خوشحال بنائیں۔ فتح و کامرانی کے طربیہ اور رزمیہ گیت گائیں سب مل کر کائنات پر قبضہ کریں اور عرصہ دراز سے منتظر دنیاوی فضاؤں کی طرف باہم دگر پرواز کریں

مگر یہ سب کچھ جب ہی ہوگا کہ ہم اپنی پیاری دھرتی کا بکھرا ہوا نظام ٹھیک ٹھاک کریں۔ ہم منافع خوروں اور تہذیب کے قاتلوں کی تمام دیدہ زیب نقابیں نوچ ڈالیں۔ تاکہ بھولے بھالے اور نیک فطرت انسان، ان کے کوڑھی چہرے دیکھ لیں ہم ان کی ہر اس چال کو الٹ دیں جن سے انسانی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہو، ہمیں گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے والے "آزاد دنیا" کے نام نہاد علمبرداروں کی محتاجی دور کرنی ہوگی۔ ہمیں طبقاتی اونچ نیچ اور ظالمانہ لوٹ کھسوٹ ختم کرنے والے انقلابی جذبہ کو فروزاں اور بین الاقوامی تحریک کی اگوائی کرنی پڑے گی۔ غرضیکہ ہمیں انسانیت کے انسانیت کے ان سماجیوالوں کے ہاتھوں سے وہ تمام اختیارات چھیننے ہونگے جو انسانی ذہن کے حسین ترین نقش و نگار کو بگاڑتے رہتے ہیں: تاکہ پھر یہ اور انکی نسل انسان کی تذلیل نہ کر سکے اور تمام دنیا کی دولت خود ہضم کر جانے کا پرانا ڈھونگ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔

اس مقدس دھرتی پر ہمارا اپنا مقدس پاکستان بھی قائم ہے۔ ہماری اپنی یہ تمنا اور آرزو ہے کہ ہمارا وطن دنیا کے افلاک پر ایک روشن اور درخشاں ستارے کی مانند اپنی تابناکی کا دائمی اجالا پھیلائے اور تھوڑی سی مدت میں ہم سے آگے نکل جانے والے دوسرے ممالک سے منزل پر پہنچنے سے پہلے جا ملے۔ ہم منافع کی اس بنیاد کو ڈھا دیں جس پر دوزخ کی تعمیر ہوتی ہے۔ اگر ہم یہ کرلیں گے تو ہمارا دیس بھی جنت بن جائے گا۔ جہاں علم چند گھرانوں سے باہر نکل کر گاؤں گاؤں اور قریہ قریہ عام ہوگا۔ زمین سوکھی نہ رہے گی۔ بلکہ کسان اسے اپنے ہل کی انی سے چیر ڈالیں گے اور پھر گیہوں کی سنہری بالیاں چائے کے باغات، کپاس کے سفید سفید پھول لہلہا اٹھیں گے، لوہا، مشینوں کی شکل میں تبدیل ہو جائے گا۔ جگہ بہ جگہ کارخانوں کی چمنیاں بلند ہو جائیں گی۔ کوئی بے روزگار نہ رہے گا۔ ہمارے تمام کاغذی منصوبے ٹھوس حقیقت کے سائے میں ڈھلنے لگیں گے اور پھر ہمارے اپنے اللہ دتہ ہمارے اپنے یوسف خاں۔ ہمارے اپنے رکن الدین اور ہمارے اپنے سہیل و کامران ہماری اپنی ہما اور فرزانہ ـــــ روسیوں اور امریکنوں سے آگے بڑھیں گی اور اونچی اڑیں گی۔



ادیب سہیل

غزل

ڈال سنگھاسن پر جو بیٹھا میٹھی بولی بول رہا ہے
اِن کے اُن کے پنکھ لگا کر اڑنے کو پر تول رہا ہے

دیپ سے دیپ تو جلتے دیکھا آپنے ہم نے سب نے لیکن
ایک بجھا کر دوجے چمکے یہ انداز انمول رہا ہے

ایک ہی سُر پر دھیان لگانا اس کے بس کا روگ نہیں جو
اِس اور اُس اور اِس پتھ اُس پتھ یونہی ڈانواڈول رہا ہے
ڈال پر ایک ہی رنگ کے لاکھوں پنچھی کا ہے بسیرا لیکن
یہ ہے حال کہ اپنی اپنی بولی ہر اک بول رہا ہے

ممکن ہے کوئی آنکھوں والا بڑھ کر اسکی پلٹ دے کایا
چند لگے ابھیمان کا سونا اب تک تو کشکول رہا ہے

آنسو سے انمول رتن کو جو پانی کی بوندیں جانے
اس اندھے مہتاب کے آگے نینا موتی رول رہا ہے

گھر کا روپ بھلا کر جو بھی پیہ دوارے پر راس رچاتے
اپنے رام تو یہ سمجھیں وہ بس میں امرت گھول رہا ہے

منہ پر پیار جو منہ پھیرو تو بُرا کہیں دلدار یہاں کے
اپنا سہیل اِن کو تو سمجھ کر بھید بھرم کیوں کھول رہا ہے

عبدالمجید سہالوی

بُرا ہو سردی کا

میں کھانا کھا چکا تھا لیکن سردی کی وجہ سے ہاتھ دھونے کی ہمت نہ پڑتی تھی ہاتھ دھونے کیلئے کمرے سے باہر جانا تو بڑی بات ہے لحاف سے ہاتھ نکالنا دشوار ہو رہا تھا بیگم میری حالت پر مسکرا رہی تھیں بچے ہنس رہے تھے اور، بیچاری بوڑھی خوشدامن لحاف سے منہ لپیٹے اندر ہی اندر سے کہہ رہی تھیں۔ بیٹا! باہر جا کے کیا کرو گے یہیں سلفچی میں ہاتھ دھولو! اماوس کے دن ہیں سردی سے لحاف میں بھی کلیجہ ہلا جا رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سینے پر برف کی سل رکھی ہے۔

خیر میرا سینہ تو سوئٹر اور لحاف کی گرمی سے کافی گرم تھا۔ ہاں! ہاتھ بالکل برف ہو رہا تھا۔ جس کا دھونا جلے پر نمک مرچ چھڑکنے سے کم نہ تھا۔ مگر دھوتا نہ تو کرتا کیا۔ لوگ برادری باہر غیر کف میں رشتہ پسند نہیں کرتے ہیں لحاف باہر جھوٹا ہاتھ اندر کیسے لاتا۔ اسلئے ہمت مرداں مدد خدا کہہ کر میں نے دل کڑا کر کے سلفچی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ بیگم نے اس کے باوجود میری کوئی ہمدردی نہ کی اور کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانے کے باوجود۔ پانی کے انتظار میں میرا ہاتھ بڑی دیر تک سلفچی کے سامنے پھیلا رہا مایوس ہو کر جب میں نے مجبوراً اپنا ہاتھ لحاف میں واپس لانا چاہا۔ تو اس نے صاف انکار کر دیا اور جب ہم نے اسے دوسرے ہاتھ سے اندر گھسیٹنا چاہا تو ہمیں محسوس ہوا کہ ہم اپنا ہاتھ نہیں کسی مردے کا ہاتھ گھسیٹے لا رہے ہیں — یہ خیال آنا تھا کہ ہاتھ سے ہاتھ چھٹ گیا اس پر بیگم کو رحم آگیا اور انھوں نے لوٹا اٹھا کر اس پر پانی اس طرح ڈالنا شروع کیا جیسے مردے کو غسل کرایا جا رہا ہو۔ غسل میت سے فراغت کے بعد ہم نے مردہ بدست زندہ، کے خیال سے اپنے مردہ جسم ہاتھ کو دفنانے کی شکل میں لحاف میں دبا دیا اور پھر لحاف کو سر سے اوڑھ کر چاروں طرف سے خوب دبا لیا اور مقبرے کی شکل میں بیٹھ کر پڑھنے لگے۔

بچے ہمیں اس حلیے میں بیٹھا دیکھ کر چپکے چپکے کہنے لگے —

بچوں سے تو میں بولوں کی نہیں
جوان ہیں میرے بھائی
بوڑھوں کو میں چھوڑوں گی نہیں
چاہے اوڑھیں رضائی۔

بیگم کو مجھے قبل از وقت بوڑھا بنتے دیکھ کر سخت ناراضگی ہوئی۔ اور اس کا بدلہ لینے کے لئے انھوں نے ریڈیو کھول دیا۔ ریڈیو کو جب سے معلوم ہو گیا ہے کہ بیگم سیلون اور ودودبھارتی کے علاوہ اور کچھ سنتی ہی نہیں وہ بغیر لگائے وہیں لگ جاتا ہے چنانچہ ریڈیو کھلتے ہی آواز آئی نکسوڈ ہم منہ کے مہاسے صاف اور چمڑی کو مخمل کی طرح نرم کرتا ہے بیگم کے خدانہ خواستہ نہ تو منہ پر مہاسے ہیں اور نہ چمڑی سخت اس لئے انھوں نے تیوریوں پر بل ڈال کر ریڈیو کے کان امیٹھے اور وہ بھاگ کر سیلون سے ودودبھارتی پہنچ گیا۔ جہاں سے سردی سے بچنے کے لئے صحیح مشورہ دیا جا رہا تھا۔ اور یہ فلمی گانا ہو رہا تھا۔!

ایک سے اچھے دو
اور دو سے اچھے چار

چنانچہ یہ نیک مشورہ سن کر بیگم کی چھوٹی بہن کتاب بند کر کے بڑی بہن کے لحاف میں آکر بیٹھ گئیں۔ اور دونوں بچے دونوں بہنوں کے ادھر ادھر لد گئے۔ اور تان سے تان لگا کر گانے لگے۔

ایک سے اچھے دو
اور دو سے اچھے چار

اس نیک مشورے پر اس طرح عمل ہوتے دیکھ کر بیگم نے ریڈیو بند کر دیا۔ بات یہ تھی کہ یہ مشورہ اسی آواز اور اسی دھن میں ایک سو ایک مرتبہ سے زیادہ سن چکی تھیں لیکن آپ جانتے ہیں کہ ع

چھٹتی نہیں ہے منہ کو یہ کافر لگی ہوئی

ہمارا خیال ہے کہ مے کی طرح فلمی گانوں کی لے میں بھی وہ نشہ ہے کہ اگر تھوڑی دیر نہ سنے جائیں تو بدن ٹوٹنے کے بجائے کان ٹوٹنے لگتے ہیں اور ظاہر ہے کہ کوئی بیوی بلاوجہ شوہر کی کتب بینی کی خاطر اپنے کان کیوں تڑوانے لگی چنانچہ انھوں نے پھر ریڈیو کے کان امیٹھے۔ لیکن بیگم کی بار بار گوشمالی سے وہ چڑ گیا تھا اس لئے دہلی بھاگ اردو مجلس کی بغل میں بیٹھ گیا۔ جہاں ایک مضمون میں نادان میزبان اور ناخواندہ مہمانوں کا گلا کیا جا رہا تھا اور کہا جا رہا تھا کہ اپنے بزرگوں کی طرح ہمارے دلوں میں بھی مہمانوں کے لئے جگہ ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ حویلی کے کھلے دالانوں اور بڑے کمروں کے بجائے ہمارے پاس دو کمروں کا چھوٹا سا فلیٹ ہے جسکے دامن میں ہمارے ہی بال بچوں کے لئے جگہ مشکل سے نکلتی ہے۔ کاش۔! اس کے دامن میں ہمارے دل کی طرح مہمانوں کے لئے گنجائش پیدا ہو سکتی۔

ابھی مضمون کے یہ الفاظ پورے بھی نہیں ہوئے تھے کہ دروازے پر دستک کی آواز سنائی دی اور جواب کا انتظار کئے بغیر ہمارے خالہ زاد بھائی لدے پھندے گھر میں داخل ہوئے۔

بیگم پہلے ہی سے اس فکر میں تھیں کہ کسی طرح مضمون ختم ہو اور یہ ہوا محل کا دلچسپ پروگرام سنیں جسکا وقت قریب آگیا تھا لیکن دلچسپ پروگرام سننے کے بجائے جب انھیں کسی ناخواندہ مہمان کے بے وقت آمد کی خبر سنائی دی تو وہ نزلہ بر عضو ضعیف، کے مطابق مجھ پر برسنے ہی والی تھیں کہ بے تکلف مہمان کمرے کے اندر پہنچ گئے اور بیگم اور انکی بہن کو سر جوڑے ریڈیو سنتے دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولے۔

کیسا کنڈل مار کر بیٹھا ہے جوڑا سانپ کا

وہ یونہی جلی بیٹھی تھیں یہ چوٹ سہہ نہ سکیں۔ لیکن مہمان کی بے وقت آمد پر خفا ہونے کے بجائے مہمان سے خفگی کا اظہار کیسے کریں۔ اس لئے انھوں نے میری پتلی گردن پر ہی وار کرنا زیادہ مناسب خیال کیا اور میری طرف اشارہ کر کے مہمان یعنی اپنے دیور سے جواباً کہا۔

کیسا کنڈل مار کر بیٹھا ہے بھیا آپ کا

میں واقعی لحاف میں ایسا کنڈل مارے بیٹھا ہوا تھا کہ ناخواندہ مہمان کیا اگر زہریلا سانپ بھی میرے اوپر سے گزر جاتا تو مجھے خبر نہ ہوتی۔ لیکن گھر بھر کے مشترکہ قہقہے نے مجھے چونکا دیا اور میں نے اپنے مقبرے کے روشن دان سے دیکھا تو خوشی کے مارے اچھل کر لحاف کے باہر کودنے ہی والا تھا کہ میرے بھائی نے جو علی گڑھ سے آبھی رہے تھے اور وہیں کے پڑھے ہوئے بھی ہیں۔ یہ کہہ کر بٹھا دیا۔ ارے! یہ کیا غضب کر رہے ہیں؟ ابھی آپ کو بال بچوں کو پالنا ہے۔ نصیب دشمناں کچھ ہو گیا تو بھابی مجھے کوس کر کھا جائیں گی۔

بھابی دراصل ہنسنے کے باوجود اب بھی دل ہی دل میں کوس رہی تھیں اور مہمان ناخواندہ ہونے کی بنا پر بچارہ سمجھ نہیں رہا تھا۔ میں نے جلے پر نمک مرچ چھڑکتے ہوئے کہا کہ ارے بھئی! ان کے لئے چائے تو بناؤ۔! سردی بہت ہے بیچارے ٹھٹھر گئے ہوں گے۔ میں چائے بنانے جا تو رہی ہوں۔ جیسے آپ نہ کہتے تو میں نہ بناتی۔ مگر اپنے پر قیاس نہ کیجئے وہ ٹھٹھرے نہیں — دراصل سردی اتنی نہیں ہے جتنا آپ کو وہم ہے بات

یہ ہے کہ اس وقت سردی میں اٹھنا انھیں بھی کھل رہا تھا۔ مگر اٹھیں نہ تو کریں کیا۔ مہمان کا معاملہ تھا۔ مگر مہمان کے جانے کے بعد میری خبر لینے کے لئے وہ ابھی سے زمین ہموار کر رہی تھیں۔ مہمان نے بھی یہ کہکر انھیں مدد دی کہ بھابی سچ کہتی ہیں سردی وردی کچھ نہیں محض آپ کا خیال ہے دوسرے میں سوتے وقت چائے پینے کا عادی بھی نہیں۔ اور کھانا میں نے ریل پر ہی کھالیا تھا۔ میں نے کہا شاید اس لئے کہ بھابی کو سردی میں اٹھ کر چولہا نہ جلانا پڑے۔ ارے بھئی انگیٹھی تو موجود ہے چائے تو چارپائی پر سے کھسکے بغیر بن سکتی ہے۔ تکلف کا ہے کا تمہاری بھابی کی مستعد ہیں۔ انھیں تو خاطر مدارات کا ہوکا ہے۔ میں مان بھی جاؤں تو وہ بھلا کب ماننے والی ہیں۔ حالانکہ اگر وہ ذرا ڈھیل پا جاتیں تو کھانے کے ساتھ چائے بھی گول کر جاتیں لیکن میرے اصرار۔ پر مہمان نے بھی کوئی زیادہ اصرار نہیں کیا۔ اس لئے انھوں نے اپنے مہمان کو نوازا اور مستعد ثابت کرنے کے لئے اس جاڑے پالے میں چائے تیار کر ہی دی لیکن نہ تو وہ چائے میں شریک ہوئیں اور نہ مہمان سے باتیں کرنے کے لئے بیٹھیں۔ بلکہ ٹرے میز پر رکھ کر اس طرح چلی گئیں جیسے ہوٹل کا بیرا ٹپ نہ دینے والوں کے سامنے چائے رکھ کر چلا جاتا ہے۔

چائے کے بعد ہم دونوں بڑی دیر تک ادب پر پھر سیاست پر اس کے بعد اس حماقت پر باتیں کرتے رہے جو ہم دونوں کر چکے تھے اور اب وہ اپنے، چھوٹے بھائی کو اس حماقت میں پھنسانا چاہتے تھے وہ باتیں کرتے کرتے خراٹے لینے لگے اور ہم بلا عادت بے وقت چائے پینے کی وجہ سے تارے گننے کے بجائے خراٹے گننے لگے۔

بیگم رات میں دیر میں سونے کی وجہ سے یا مہمان کی خاطر مدارات سے منہ چرانے کی غرض سے ابھی تک منہ لپیٹے پڑی تھیں۔ میرے بھائی، جگ چکے تھے اور جانے کی تیاری کر رہے تھے میں چونکہ سویا ہی نہ تھا۔ اس لئے میرے جگنے کا سوال ہی نہ اٹھا۔ ویسے بدگمانی کی دوسری بات ہے کہ آپ سمجھ لیں کہ میں سردی کے ڈر سے نہیں اٹھ رہا تھا مگر جب میرے بھائی اس سردی کے باوجود سفر کے لئے تیار ہو گئے اور علیک سلیک کی منزل آ گئی تو میں گھبرا کر لحاف سے نکل پڑا۔ لیکن انھوں نے زبردستی پھر لحاف میں لٹا دیا اور کہنے لگے چلتے چلاتے آپ ایسی بدپرہیزی نہ کیجئے کہ خواہ مخواہ مجھے شرمندگی ہو اور آپ کو تکلیف اٹھانا پڑے۔ چار و ناچار مجھے مہمان کی خاطر لیٹے رہنے کی بدتمیزی بھی برداشت کرنی پڑی۔ لیکن میں نے لیٹے ہی لیٹے کہا کہ تو پھر ناشتہ واشتہ؟ کہنے لگے جب میں گھر پہونچوں گا تو ٹھیک ناشتے کا وقت ہوگا۔ ابھی تو بہت سویرا ہے میں نے کہا بھابی سے تو مل لو۔ انھوں نے کہا جی ہاں! انھیں سے ملنے کی تیاری کر رہا ہوں۔ اس کے بعد انھوں نے سامان سے ایک ڈبا نکالی جس میں بسکٹ کے علاوہ مٹھائی بھی ضرور تھی اس لئے کہ چاہے میں عطر کی خوشبو نہ پہچان سکوں مگر مٹھائی کی خوشبو پہچاننے میں مجھ سے غلطی، ناممکن ہے۔ اس کے بعد انھوں نے قلم نکال کر پرچے پر کچھ لکھا اور ڈبیا میں رکھ کر بھابی کے کمرے میں گئے لیکن ان کو جگانے کے بجائے ان کے سرہانے میز پر ڈبیا، رکھ کر اور مجھ سے پھر ملنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گئے۔

غالباً بیگم کو جب انکے جانے کا یقین ہو گیا تو وہ، زبان حال سے یہ مصرعہ پڑھتی ہوئی اٹھیں۔

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

اس کے بعد جب منہ دھوکر آئینے کے سامنے کھڑا بال ٹھیک کر رہا تھا تو آئینہ میں بیگم کا بگڑا ہوا چہرہ دکھائی دیا۔ جس پر ایک رنگ آ رہا تھا ایک رنگ جا رہا تھا اور ڈبیا کے قریب پڑھ رہی تھیں اور انکی حالت زار سے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ سوچ رہی ہیں کہ چھت پھٹ جائے اور سما جائیں۔ میں نے، اس خیال سے کہ وہ جو سوچ لیتی ہیں وہ کر لیتی ہیں۔ ان کا شانہ پکڑ کر کہا۔

"مجھ کو بھی تو بتاؤ! کیا بات ہے؟ اس کے بعد انھوں نے مجھے پرچہ دیدیا اور یہ کہتے ہوئے سر پکڑ کر بیٹھ گئیں برا ہو سردی کا، میں خاطر بھی نہ کر سکی۔

پرچہ حاضر ہے آپ بھی پڑھیئے اور میں بھی۔!

پیاری بھابی!
بارہ بجے پہونچنے کی جلدی تھی اس لئے
شرمندہ ہوں کہ رخصت نہ ہو سکا۔ میں
یہاں آپ کی چھوٹی بہن کی نسبت کے
سلسلے میں بات چیت کے لئے اتر پڑا
تھا۔ آپ سو گئی تھیں بھائی صاحب
کو مختصراً بتا دیا ہے۔ لڑکا میرا چھوٹا بھائی
یعنی آپ کا چھوٹا دیور ہے اور ڈاکٹری
کے آخری درجے میں پڑھ رہا ہے۔
اگر موقعہ ملا تو واپسی میں حاضر ہونگا
اس وقت تفصیلی بات چیت ہو گی
آپ کا ناخواندہ
مہمان



شمیم حنفی

ہم ہیں پریت نگر کے باسی ہم سے رسم وفا نکلی
ایک ہمارے دم سے یارو دنیا سی دنیا نکلی
ہم کو گماں تھا چاند کے پیالے میں ہو گی صہبائے خلوص
پی جو چکے تو اپنے منہ سے بوئے جور و جفا نکلی
قرب میں دوری کا عالم تھا ہم کس درجہ پریشاں تھے
جس کو ہم دیوار سمجھتے تھے وہ تیری حیا نکلی
اے دل روپ نگر کی گلیوں میں کیسا سناٹا ہے
کل جو بستی صحن چمن تھی آج اک ویرانہ نکلی
اے غم جاناں اے غم جاناں تجھ سے بچ کے کہاں جاتے
دنیا بھی اپنی نظروں میں تیری ایک ادا نکلی
رات نے اپنے بال سمیٹے سورج نے انگڑائی لی!
ننھی ننھی کلیوں کا دل خوں کرنے کو صبا نکلی
دنیا والو اوپر دیکھو عرش تلک آ پہنچے ہم
ایک کرن سوز الفت کی اپنی راہ نما نکلی
ہم نے وفا کے راگ الاپے کوئی ٹس سے مس نہ ہوا
اپنی صدا بھی اس بستی میں آواز صحرا نکلی
ایک ذرا سی جنبش لب پر چیخ اٹھی ساری دنیا
ہونٹوں تک جو بات نہ آئی جانے کیا سے کیا نکلی

علی ناصر زیدی

ہوابازی



بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دھکیلو پنکھے طیارے کے بازوؤں پر ہوا چھوڑتے ہیں۔ یہ درست نہیں۔ دھکیلو پنکھوں کی جگہ ایسی ہوتی ہے کہ انکی ہٹائی ہوئی ہوا جسے "واش" کہتے ہیں بازوؤں پر پھیلنے والی ہوا سے الگ رہتی ہے۔ دھکیلو پنکھے کا کام ہوائی جہاز کو آگے دھکیلنا ہے تاکہ ہوا بازوؤں پر پھیلتی رہے جب کوئی ہوائی جہاز اپنے اڈے پر دوڑتا ہے تو اس کا پنکھا اس کی رفتار میں برابر اضافہ کرتا جاتا ہے۔ اور ہوا کے تصادم سے بازوؤں کی نچلی سطح پر اتنا زیادہ دباؤ پڑتا ہے کہ پورا طیارہ اوپر اٹھ جاتا ہے۔

ہوائی جہاز پر کس طرح قابو رکھا جاتا ہے؟

ہوا سے بھاری پرواز اس وقت تک ممکن نہ ہو سکی جب تک مندرجہ ذیل تین مسائل حل نہ ہوئے۔

۱:۔ وزن کو سنبھالنے والی مناسب سطحوں کا انتظام ہم پڑھ چکے ہیں کہ بازوؤں میں خم پیدا کر کے یہ مسئلہ حل کیا گیا۔

۲:۔ وزن بڑھائے بغیر کافی قوت کی فراہمی۔ یہ مسئلہ ہلکے وزن کے اندرونی احتراقی انجنوں نے حل کیا۔

۳:۔ دوران پرواز توازن قائم رکھنا۔ اب ہم اس مسئلہ کے چند پہلوؤں پر روشنی ڈالیں گے۔

قابو میں رکھنے والی سطحیں

ہوائی جہاز سہ البعادی جگہ میں حرکت کرتے ہیں آگے تین طرح کی تبدیلیاں بیان کیجا سکتی ہیں جو طیارے میں اپنے گرد و پیش کی نسبت سے پیدا ہوتی ہیں۔ بہتر ہوگا آپ اپنے تئیں ہوائی جہاز سمجھ لیجئے۔ آپ اپنے بازو پھیلائے ہوئے خلاباز کی طرح اڑتے چلے جاتے ہیں۔ فرض کیجئے اب آپ زمین کی نسبت سے اپنے جسم میں کچھ تبدیلی پیدا کرنا چاہتے ہیں جسے "پچ" (PITCH) کہتے ہیں سمندر بحری جہاز کی تبدیلی کے لئے بھی یہی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے آپ بائیں یا دائیں جانب مڑنا چاہتے ہیں یا آپ ذرا ٹیڑھا ہونا چاہتے ہیں۔ تاکہ آپ کا ایک بازو اوپر اٹھ جائے اور دوسرا نیچے گر جائے۔ بحری سفر میں بھی یہ اتفاق پیش آتا ہے۔ جب جہاز تہہ و بالا ہوتا ہے اور مسافروں کو متلی محسوس ہونے لگتی ہے۔

ہوائی جہاز میں اس قسم کی تبدیلیاں پیدا کرنے کے لئے ہوا باز بعض سطحوں کو حرکت دیتا ہے جو طیارے سے ملحق ہوتی ہیں اور جنہیں دروازے کی طرح حرکت دی جاسکتی ہے۔ جب انھیں گھمایا جاتا ہے تو ہوائی جہاز کی جگہ بدل جاتی ہے۔

پچ کے لئے طیارے کی دم پر ایک پرزہ لگا رہتا ہے جسے ایلی ویٹر (ELEVATOR) کہتے ہیں۔ جب اسے اونچا کیا جاتا ہے تو طیارے کا پچھلا حصہ نیچا ہو جاتا ہے اور اگلا حصہ اوپر چلا جاتا ہے۔ جب ایلی ویٹر نیچے ہوتا ہے تو اس کے برعکس عمل ہوتا ہے۔

دائیں بائیں مڑنے کے لئے ایک اور پرزہ استعمال کیا جاتا ہے جسے "رڈر" (RUDDER) کہتے ہیں یہ پرزہ بھی طیارے کے پچھلے حصہ پر لگا ہوتا ہے۔ بحری جہاز کی طرح حرکت کرنے کے لئے ہوائی جہاز میں دو "ایلرون" (AILERON) استعمال کئے جاتے ہیں۔ یہ پتریاں بازوؤں کے پتلے کناروں سے ملحق ہوتی ہیں اور ایک دوسرے کے مخالف سمت میں عمل کرتی ہیں۔ جب ایک کو اوپر کیا جاتا ہے تو دوسرا ایلرون خود بخود نیچے ہو جاتا ہے۔

ایک اور پرزے کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے یعنی انجن کا تھروٹل (THROTTLE) جو دھکیلو پنکھوں کی فراہم کردہ قوت پر قابو رکھتا ہے۔

داخلی توازن

ہوا باز ایلی ویٹر، رڈر، اور ایلرون پر پورا قابو رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ طیارے میں توازن بھی ہونا چاہئے۔ یعنی اگر تیز ہوا یا اس کی اپنی جنبش کی وجہ سے کوئی دقت پیش آئے تو اسے طیارہ خود بخود درست کر لے اگر ہوا باز کو قدم قدم پر ایسی خامیوں کی اصلاح کرنی پڑ جائے تو پرواز ممکن نہیں ہو سکتی۔ جہاں تک ممکن ہو طیارے کو اپنی مدد آپ کرنی چاہیئے۔ طیارے کے بالکل پیچھے ایک عمودی پرزہ ہوتا ہے جیسے مچھلی کی دم ہوتی ہے۔ وہ طیارے کو ادھر ادھر حرکت کرنے سے باز رکھتا ہے۔ ایک پرزہ اسے زمین کے متوازی رکھتا ہے اور اس کے اگلے پچھلے حصوں کو اوپر نیچے نہیں ہونے دیتا۔ بازوؤں کی شکل ایسی ہوتی ہے کہ طیارہ لوٹ پوٹ نہیں ہوتا۔ بازو سامنے کے موٹے اور پھر بتدریج پتلے ہوتے چلے جاتے ہیں ان کی وجہ سے پورا طیارہ متوازن رہتا ہے۔ یہ ہیں وہ متحرک پرزے جو طیارے کو قابو میں رکھتے ہیں اب ہم رڈر کے متعلق بعض غلط فہمیاں دور کرنا چاہتے ہیں ہوائی جہاز کا رڈر بھی وہی کام انجام دیتا ہے جو بحری جہاز کا رڈر انجام دیتا ہے یعنی جب طیارے کو دائیں یا بائیں مڑنا ہو تو وہ اپنے رڈر سے مدد لیتا ہے اس کے علاوہ ایلرون اور بازو بھی مڑنے میں بہت زیادہ مدد دیتے ہیں۔ اس لئے اس سلسلے میں ہم ذیل میں ایک امریکی کتاب کا اقتباس پیش کرتے ہیں۔

FLIGHT INSTRUCTIONS MANUAL OF THE UNITED STATES CIVIL AIR AUTHORITY (TECHNICAL MANUAL 100, APRIL 1951) PAGE 43.

> "طیارہ رڈر کی مدد سے نہیں گھومتا۔ بلکہ بازوؤں کو اٹھانے والی قوت کی سمت عمودی نہیں رہنے دی جاتی۔ اسے مطلوبہ سمت میں موڑ دیا جاتا ہے۔ طیارہ کشش ثقل پر حاوی رہتے ہوئے اس طرف گھوم جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ایلرون مدد دیتے ہیں۔"

اسی کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ رڈر طیارے کو مطلوبہ سمت کی مخالف سمت میں گھومنے سے روکتا ہے۔ دوسرے

الفاظ میں یوں سمجھئے کہ طیارے کو گھمانے کے لئے اسے ذرا ٹیڑھا کیا جاتا ہے اور بازوؤں کو اٹھانے والی قوت اس مقصد کے لئے بھی استعمال کی جاتی ہے رڈر کو تنہا اس مقصد کیلئے استعمال کرنا ایسا ہی ہے جیسے برف پر دوڑنے والی موٹر کار کو یکایک ایک طرف موڑ دیا جاتا ہے۔ اس کا رخ تو مڑ جاتا ہے لیکن وہ اصل سمت میں پھسلتی چلی جاتی ہے۔

ہوائی جہاز چلانا

روانگی:-

جب ہوا باز تمام پرزوں کا جائزہ لے چکتا ہے اور تمام مسافر بیٹھ جاتے ہیں۔ تو وہ ہوائی اڈے کے کنٹرول ٹاور سے روانہ ہونے کی اجازت ریڈیو کے ذریعہ طلب کرتا ہے پہیوں پر بریک لگائے ہوئے وہ پہلے انجن کو گرم کرتا ہے جب پنکھا تیزی سے گھومنے لگتا ہے تو وہ بریک کھولتا ہے اور سڑک پر دوڑتا ہوا ہوا میں اٹھ جاتا ہے کنٹرول ٹاور سے اس کا رابطہ برابر قائم رہتا ہے۔

ہوائی جہاز کو سڑک پر دوڑاتے وقت ہوا باز اس کا تھروٹل کھول دیتا ہے۔ جب رفتار بڑھتی ہے تو بازوؤں کو اٹھانے والی قوت پورے طیارے کے وزن کے قریب قریب برابر ہوتی ہے۔ ہوا باز "جوائے اسٹک" (JOY STICK) یا پہیہ، کو تھوڑا سا آگے کی طرف جھکا دیتا ہے اور ایلی ویٹر قدرے نیچا ہو جاتا ہے۔ اس طرح طیارے کا پچھلا حصہ اوپر اٹھ جاتا ہے اس کی رفتار میں برابر اضافہ ہوتا جاتا ہے حتیٰ کہ وہ زمین سے اٹھ جاتا ہے اب ایلی ویٹروں کو تھوڑا سا اوپر کر دیا جاتا ہے۔ طیارہ آہستہ آہستہ زمین سے اٹھتا ہے اور برابر اونچا ہوتا رہتا ہے حتیٰ کہ وہ مطلوبہ بلندی حاصل کر لیتا ہے۔ اس وقت ایلی ویٹر برابر کر دیئے جاتے ہیں۔

ہموار پرواز

ہموار یا متوازی الارض پرواز میں ہوا باز گھومنے کے لئے ایلرون اور راڈر استعمال کرتا ہے۔ ایلرون، جوائے اسٹک یا پہیے سے قابو میں رکھے جاتے ہیں۔ جو ایلی ویٹر کو قابو میں رکھتا ہے۔ ایلرونوں کو حرکت دینے کے لئے اسٹک کو دائیں بائیں گھمایا جاتا ہے۔ دائیں طرف گھومنا ہو تو اسٹک کو دائیں جانب گھمایا جاتا ہے۔ دایاں ایلرون اوپر اٹھ جاتا ہے اور بایاں نیچے ہو جاتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پورا طیارہ دائیں جانب گھوم جاتا ہے اس کا دایاں بازو دب جاتا ہے اور بایاں بازو اوپر کو اٹھ جاتا ہے جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے گھومتے وقت ہوا باز رڈر کو بھی تھوڑی سی حرکت دیتا ہے۔ رڈر کو قابو میں رکھنے کے لئے پیر سے چلنے والے پیڈل استعمال کئے جاتے ہیں۔ دائیں جانب گھومتے وقت بائیں پیڈل کو آگے کو دھکا دیا جاتا ہے اور رڈر دائیں طرف گھوم جاتا ہے اور رڈر دائیں طرف گھوم جاتا ہے۔ بائیں جانب گھومنے کے لئے جوائے اسٹک اور پیڈل کو مخالف سمت میں حرکت دی جاتی ہے۔

زمین پر اترنا

اترتے وقت ہوا باز طیارے کے اگلے حصہ کو زمین کی طرف جھکا دیتا ہے۔ اور طیارے کی رفتار کو کم کرتا جاتا ہے۔ رفتار کم ہوتی ہے تو طیارے کی اٹھان بھی کم ہو جاتی ہے اور وہ آہستہ آہستہ نیچے آنے لگتا ہے ہوا باز ایئرپورٹ کے کنٹرول ٹاور سے اترنے کی اجازت طلب کرتا ہے۔ نیز یہ پوچھتا ہے کہ وہ کون سے رن وے یا سڑک پر اترے۔ جب طیارے کی بلندی اور رفتار خاصی کم ہو جاتی ہے تو وہ نیچے اتر آتا ہے۔ اسکا اگلا حصہ کچھ نیچے ہوتا ہے۔ جب زمین بالکل قریب ہو جاتی ہے تو ہوا باز اس حصے کو برابر کر دیتا ہے

بڑے ہوائی جہازوں پر شاید آپ نے اضافی بازو جیسی ایک چیز دیکھی ہو جو دونوں بازوؤں کے نچلے کناروں پر ایلرون اور طیارے کے درمیان لگی ہوتی ہے۔ اسے "فلیپ" (FLAP) کہتے ہیں۔ فلیپ زمین پر اترتے وقت اور پرواز کرتے وقت استعمال کئے جاتے ہیں، جب کوئی طیارہ زمین پر اترنے والا ہوتا ہے تو فلیپ جو عام طور پر بازوؤں کے اندر ہوتے ہیں، باہر نکل آتے ہیں اس طرح بازوؤں کی سطح میں اضافہ ہو جاتا ہے اور ہوائی جہاز کو سنبھالا مل جاتا ہے۔ وہ احتیاط سے زمین پر اتر آتا ہے۔ فلیپ ہوائی بریکوں کا کام بھی دیتے ہیں اور ہوائی جہاز کی رفتار کم کر دیتے ہیں۔ زمین سے اٹھتے وقت فلیپ طیارے کو زیادہ سے زیادہ قوت دیتے ہیں۔

بقیہ

متحرک فلموں کی تاریخ

آہنگی ایمانداری فلمی صنعت کے چار اہم ستون ہیں جن پر فلمی صنعت کی عمارت کھڑی ہے۔ عام خیال یہ بھی ہے کہ اس صنعت میں آوارگی اور بے راہ روی زیادہ ہے۔ مگر یہ بالکلیہ عام خیالی ہے ایسی باتوں کا دور دور کوئی واسطہ نہیں۔ اس کے برعکس دنیا کے کسی شعبہ میں جہاں غیر ذمہ دارانہ ذہنیت کارفرما ہوتی ہے اس فلمی صنعت کی نام نہاد آوارگی اور بے راہ روی سے کہیں زیادہ بدعنوانیاں اور ہوس کاریاں موجود ہیں۔ مگر سرمایہ داری ان بدعنوانیوں کی ہمیشہ پردہ داری کرتی رہی ہے۔

احمد جمیل

غزل

تری محفل سے کیا اٹھ کر گیا ہوں
میں یوں زندہ ہوں گویا مر گیا ہوں

نہ جانے بات کیا ہے اس گلی میں
بہت چاہا، نہ جاؤں، پر، گیا ہوں

کسے شہکار ٹھہراؤں کہ میں تو
ہر اک تصویر میں خوں بھر گیا ہوں

بہت نازک ہے احساسِ محبت
تجھے نزدیک پاکر ڈر گیا ہوں

مری زندہ دلی کو رونے والو!
میں اپنے آپ پر ہنس کر گیا ہوں

افق کی خون آلودہ حدوں تک
جنونِ شوق میں اکثر گیا ہوں

مری پستی بھی کیسی دیدنی ہے
کبھی میں آسمانوں پر گیا ہوں

علی حمزہ گوہر



بس اسٹاپ پر چند لمحے

زندگی ہر قدم پر، ہر راہ میں سرگرم سفر ہے رقصاں ہے، متحرک ہے۔ لیکن اگر یہ کبھی ایک لمحے کے لئے بھی ٹھہرتی ہے تو بس اسٹاپ پر۔

ٹھہرنے سے مراد یہ ہرگز نہیں کہ زندگی برف کی سل کی طرح منجمد ہو جاتی ہے۔ بلکہ زندگی کے مختلف روپ، مختلف پہلو اور مختلف رنگ ایک حلقہ میں نظر آتے ہیں جیسے قوس و قزح۔

پورے تین سال ہونے کو آئے جب مجھے پہلی بار بس اسٹاپ کا غیر اہم تصور کچھ اہم نظر آنے لگا۔ پھر وقت گزرتا گیا، بس اسٹاپ ایک خشک سا بھلا خیال نہ رہا بلکہ اس سے کچھ حسین یادیں وابستہ ہو گئیں۔

شروع میں تو میں ہر شخص کی طرح ضرورتاً بس اسٹاپ پر جایا کرتا۔ لیکن پھر ارادی طور پر اور کبھی غیر ارادی طور پر جانے لگا۔ حادثات زندگی میں ضرور آتے ہیں۔ کبھی کسی بھیس میں کبھی کسی روپ میں۔ میری زندگی میں بھی ایک حادثہ آیا۔ اور وہ بھی بس اسٹاپ پر کسی چلتی ہوئی سڑک پر حادثہ ہوتا تو زخم لگتے مرجاتا۔ تو مرجاتا۔ زندہ رہتا تو زخم بھر ہی جاتے۔ لیکن اس ٹھہرے ہوئے مقام پر حادثہ پیش آیا اور میں جواب تک صرف اپنے لئے زندہ تھا۔ اپنی خواہشوں کا احترام کرتا تھا اور صرف اپنے محبوب کو حاصلِ زندگی سمجھتا تھا ہلاک ہو گیا اور مجھ میں جو ایک شخص نہاں تھا جاگ اٹھا اور جکی زندگی دوسروں کے لئے تصور کی ایک دلہن بیوہ ہو گئی تو کیا ہوا۔؟ میر فکر کی لامحدود وسعتوں میں بسنے والی دوشیزاؤں کے چہروں کے پھول تو کھل اٹھے —

آج سے پہلے جب میں بس اسٹاپ پر آیا کرتا تھا تو مجھے لوگ دیکھا کرتے تھے۔ اس لئے کہ میرے ساتھ میری زندگی کا ایک حسین فریب ہوا کرتا تھا۔ تین سال کا عرصہ دیکھو تو کچھ نہیں سوچو تو وقت کے سمندر کی ایک بڑی گہرائی ہے۔ اس عرصہ میں میں نے کیا کچھ نہ کھویا! لیکن اب جب ایک بے وفا نے میری آنکھیں کھول دی ہیں میری روشِ فکر بدل چکی ہے۔ میری منزل بدل چکی ہے راہیں مختلف ہو گئیں ہیں۔ میرا اور بس اسٹاپ کا ساتھ اب بھی باقی ہے ہاں آپس کے تعلق کی، نوعیت بدل گئی ہے۔ پہلے میں وقت کا انتظار کرتا تھا اب وقت میرا . . . . . پہلے یہاں کھڑے ہونے والے لوگ مجھے دیکھتے تھے اور اب میں ان لوگوں کو۔

سامنے بنگلے سے آئے ہوئے نوجوانوں کو جن کے کپڑے مسلسل استری کی وجہ سے سخت ہو گئے ہیں جن کے بال ہوائی فیشن کی گود میں بکھرے ہوئے ہیں اور جنکے قہقہے بلا مقصد ہیں اور وہ خود ایک دوسرے کے ذہنوں پر بار۔ اور بس اسٹاپ پر کھڑے ہو کر کسی رکشے کا انتظار کر رہے ہیں — دیکھ کر ایک ہلکی سی ہنسی آتی ہے۔

اور میری نظر قریب کے ایک اسکول سے چھوٹے ہوئے بچوں پر بھی ہے جو اپنے نازک ہاتھوں میں مستقبل کی تاریخ لئے ہیں اپنے بستے سے مذاق کر رہے ہیں۔ کوئی کتاب گر جائے تو اسے جھاڑ کر کون اٹھائے؟ ہاتھوں میں کھلونا کیوں نا بنائی جائے۔ ایک لڑکا مختلف قسم کی حرکتیں کرکے اپنے ایک استاد کی نقل اتار رہا ہے۔ دوسری طرف چند نوجوان لڑکے سامنے کھڑی ہوئی طالبات پر آوازے کس رہے ہیں۔ اور ان کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ ہے جیسے انکی، شان میں قصیدہ پڑھا جا رہا ہو لڑکے اپنے جملوں میں کثرت سے مختلف نام دہرا رہے تھے اور لڑکیاں تو محاورے کی بلکہ روزمرہ کی صورت اختیار کر گئیں تھیں کہاں تک کوئی زبان سنبھالے۔؟

میرے ذہن میں وہ منتشر خوشبوئیں بھی ہیں جو بس اسٹاپ کے ایک کونے میں کھڑی ہوئی نوجوان دوشیزاؤں کے وجود سے مترشح تھیں۔ لوگ بوئے پیرہن کے قائل ہیں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ پیرہن تو کیا۔ جسم مہکتے ہیں۔ خوبصورت چہرے میک اپ کے مرہونِ منت — ہر شخص جو بس اسٹاپ پر آتا۔ ارادی یا غیر ارادی طور پر انکی طرف ضرور دیکھتا ہے۔ سنجیدہ اور متاثر نگاہوں سے۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ ان ماہ پیکروں کی آنکھیں بڑی بیزاری سے کبھی خود کو اور کبھی پبلک کو دیکھتی ہیں جبھی تو ہر آنے والی بس کی طرف وہ اپنے آپ کو بڑھا دیتیں۔ لیکن جیسے بس ان سے کہتی ہو "سوری رونگ نمبر" اور میں ہنس دیتا۔

لیکن اسی بس اسٹاپ پر کچھ ایسے جانے پہچانے چہرے بھی ہیں۔ جنھیں میں عقیدت سے دیکھتا ہوں سنجیدگی سے انکے بارے میں سوچتا ہوں اور آنے والے دور کی خوشخبری سے عجیب سی خوشی محسوس کرتا ہوں۔

مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر ایک نوجوان جسکے، موٹے کپڑوں پر مٹی کی جگہ جگہ بن گئی ہیں۔ جسکے چھوٹے چھوٹے بال کنگھی کے احسان مند نہیں۔ جو اپنے مضبوط کاندھوں پر کدال لئے کھڑا ہے۔ اسے اسکی منزل مل جائے گی۔ لیکن وقت کا انتظار ہے جب ان خوش پوشاک بابو لوگوں کا رش کم ہو جائے گا اور اس کے اور اس کے کدال کو بس میں جگہ مل جائے گی تو وہ اپنے گھر جائے گا۔

اس کے قریب ہی ایک لڑکا جسکے ہاتھ میں کھانے کا ڈبہ ہے میلے کچیلے کپڑوں میں کھڑا اسکول

کے بچوں سے باتیں کر رہا ہے اور انکی باتیں بڑی، حسرت سے سن رہا ہے۔ فلاں کے باپ نے آنے والی ہیلی کو ۵ روپے دینے کا وعدہ کیا ہے — اور اسکو تو اپنے بیمار باپ کو ۵۰ روپے دینے ہیں۔ دوائی کے لئے۔ اس کے ساتھ اس کا چھوٹا بھائی کھڑا ہے۔ اس کے چہرے سے بلا کا رنج و محن پھوٹ رہا ہے۔ جیسے کسی بھیڑ میں کوئی بچہ اپنی ماں سے بچھڑ گیا ہو۔ سیاہ رنگ کی ہلکی سی تہہ اس کے سارے جسم میں چھائی ہوئی ہے جیسے دن بھر کسی چمنی کے قریب بیٹھا رہا ہو جہاں سے گرم اور کسیلا دھواں نکلتا رہا ہو۔ ہر بس کے پیچھے دونوں بھائی تیزی سے بھاگتے ہیں۔ بس رکتی ہے۔ اچھے صاف ستھرے کپڑوں میں اچھے صاف لوگ اترتے اور چڑھتے ہیں۔ لیکن یہ بیچارے گندے بچے یونہی کھڑے رہ جاتے ہیں دوسری بس کے انتظار میں۔ میری نظریں ان ننھے قدموں کو خراج تحسین ادا کرتی ہیں جو سڑک کی ننگی چھاتی پر اپنے نقوش چھوڑ دیتے ہیں۔ ہوا کی تہوں میں جانے ایسے کتنے زندہ نقوش پنہاں ہیں پھر میری نظریں اسکول کی اس لڑکی کی طرف خود بخود اٹھ گئیں۔ جس کے ایک ہاتھ میں کتابیں۔ اور دوسرے ہاتھ میں ادھ بنا سوئٹر تھا۔ اس کا چہرہ، گلاب کے پھول کی طرح شاداب اور مریم کی مورتی کی طرح مقدس، آنکھوں میں شبنمی ٹھنڈک۔ اور بالوں کی لٹوں میں اک سہانا بھولا پن، لیکن اس کے کپڑے

.... ٹھیک تو ہیں — پھر وہ اپنی سہیلیوں سے الگ کیوں کھڑی ہے؟ کاش میں نے پہلے کسی سڑک سے محبت نہ کی ہوتی تو — نہیں ایک بار محبت کی تو اب تک سزا بھگت رہا ہوں — یہ بھی تو لڑکی ہے نا لڑکی —! میرے ذہن میں کسی بے وفا کا چہرہ ابھرا اور پھر میں اپنے سے معروف گفتگو رہا۔ وہ لڑکی کبھی کبھی میری طرف دیکھ لیتی لاپرواہی سے۔ لیکن اسکی نظر جب میری غائل، بے استری کی قمیض اور بغیر پالش کئے ہوئے جوتوں پر پڑی تو میری لاپرواہی پر وہ اپنی نظروں کی لاپرواہی قربان کر دیتی کھٹ کھٹ، کھٹ۔ ایک فقیر کی بیساکھی کی آواز قریب آ رہی تھی۔ بوڑھا فقیر خاموش تھا۔ اسکی آنکھیں کچھ مانگ رہی تھیں، پیسے نہیں — روشنی۔ کھٹ، کھٹ، کھٹ اسکی بیساکھی جیسے سوئی ہوئی زمین کو جگانا چاہتی ہو — میں نے چپکے سے ایک جملہ کہا " ان ہم وطنوں کو میرا سلام جو اپنی گود میں ایک انقلاب کی پرورش کر رہے ہیں "

منشور سب کا ہے!

خود پڑھئے!

دوسروں کو پڑھائیے —!

انجم ضیا

غزل

شمع کی طرح پگھل جاتے ہیں
نغمہ و نور میں ڈھل جاتے ہیں

میرے اشکوں پہ نہ ہوں آپ ملول
اشک تو یوں ہی مچل جاتے ہیں

دین و دل لیکے بھی وہ برہم تھے
لوگ نظروں سے بہل جاتے ہیں!

آپ کی بات نہ بدلی ہم نے
آپ ہر لحظہ بدل جاتے ہیں

ان کا پروانوں سے کہنا انجم
کیسے نادان ہیں جل جاتے ہیں!

مثال رضوی

جلتے چراغ

یہاں تو کوئی بھی واقف نہ تھا حقیقت سے
چھپا کے رکھا تھا سینے میں راز کو گل نے
اب ایک شور ہے سرگوشیاں ہیں چرچے ہیں
چمن میں آگ لگا دی ہے سوزِ بلبل نے

یہ آنچ کیسی ہے سارا چمن سلگ اٹھا
بہار کا ہے یہ پہلو بھی اک نہ تھا معلوم
گلوں کے چہروں سے ہے سرخی شفق پیدا
یہ کس نے آگ لگائی یہاں خدا معلوم

اندھیری رات میں دیکھا مثال اک منظر
بساطِ ارضِ چمن پہ چراغ جلتے تھے!
قریب جا کے جو دیکھا تو یہ ہوا معلوم
غریب پھولوں کے سینے کے داغ جلتے تھے

انٹرویو نمبر ۴

ایک شخصیت ایک خاکہ

حاجی عدیل

ابنِ ایوب



مجھے انٹرویو لینا تھا!
انھیں انٹرویو دینا تھا!

ہم دونوں اطمینان سے ایک دوسرے کے بالمقابل بیٹھ گئے۔ میں نے قلم سنبھالا اور انھوں نے پان نکال کر منہ میں رکھا اور آڑے ترچھے منہ چلانے لگے۔ یہ انٹرویو کے لئے انکی تیاری تھی۔

کشادہ پیشانی چھوٹی، چھوٹی آنکھیں۔ پتلے پتلے ہونٹ، ستواں ناک یہ سب چیخ چیخ کر مشکو احمد ابنِ ایوب کی دلی کیفیات اور جذبات اور انکے ناقابل شکست عزم و حوصلے کا راز فاش کر رہے تھے — میرے سامنے ان کا چہرہ ایک آئینہ بنا ہوا تھا۔ ایسا آئینہ جس میں ان کے کردار کے ساتھ ساتھ معاشرے کی بے انصافیوں اور بلند و پست کے امتیازات کا عکس پیشانی کی شکنیں بن کر ابھر رہا تھا۔ محنت کشوں کی ازلی محرومی استخوانی چہرے کا روپ دھارے ہوئے تھی ایک نئی خوش رنگ سحر کا انتظار پان کی سرخی بن کر بھنچے ہوئے مضبوط کشادہ جبڑوں پر پھیلا ہوا تھا۔ کبھی کبھی آنکھوں کے خالی ساغر اس تلخ حقیقت کے غماز تھے کہ انکی شراب اشکوں میں ڈھل کر بہہ چکی ہے — میں سوچنے لگا کہ ہمارا مورخ جکا قلم ہمارے تراشیدہ بتوں کے خد و خال لکھ رہا ہے۔ اس حقیقت سے بے خبر نہیں کہ آنے والی نسلیں آنسو بہانے والے ان افراد کو کس نام سے یاد کریں گی . . . .

"کیا آپ صرف مجھے دیکھنے ہی آئے ہیں۔؟"
ابن ایوب صاحب نے مجھے محویت سے چونکا دیا
"دیکھ تو چکا۔ اب کچھ سننے کا منتظر ہوں۔ آپ اپنی داستان ابتدائی زندگی کے حالات سے شروع کیجئے" میں نے کاروائی کا آغاز کیا۔
"بالکل ہی ابتداء سے لیجئے" انھوں نے

پان کو دانتوں تلے بے دردی سے کچلتے ہوئے کہا۔ دسمبر ۱۹۲۶ء کی کسی تاریخ کو قصبہ انبہٹا ضلع سہارنپور میں پیدا ہوا تھا۔ والد دیوبندی مولوی تھے۔ اسی بناء پر ہمارا گھرانہ کافی عزت و وقار کا حامل تھا۔ اس عزت ووقار میں روپے پیسے کا کوئی دخل نہ تھا۔ کیونکہ دادا صاحب کے انگریز دشمن نظریات کی بنا پر ہمارا خاندان مالی خوشحالی حاصل نہ کرسکا تھا۔ بہر حال ہمارا بچپن اچھا گزرا یہاں تک کہ ۱۹۳۹ء میں والد صاحب کا انتقال ہوگیا۔ اسوقت میں اور میرا چھوٹا بھائی نویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ اس کم عمری میں گھر کی پوری ذمہ داری ہمارے کاندھوں پر آپڑی اور ہم دونوں نے مسئلے کا حل یہ نکالا کہ ایک بھائی پڑھے اور دوسرا تعلیم ترک کرکے ملازمت کرے۔ اس کا فیصلہ کرنے کے لئے قرعہ ڈالا گیا جو مجھ دیوانے کے نام نکلا اور یوں میری عملی زندگی کا آغاز ہوگیا۔"

کچھ دیر کے لئے وہ خاموش ہوگئے۔ پان پر دانتوں کی گردش تیز ہوگئی۔ اور انگلیاں کرسی کے ہتھے پر مضراب کرنے لگیں۔ پھر ایک جھٹکے سے انھوں نے سلسلۂ گفتگو شروع کردیا۔

"ہاں تو سب سے پہلے میں نے حامد اینڈ کمپنی میں سیلز مین کی حیثیت سے ملازمت کی۔ اس ملازمت میں شراب فروخت کرنا پڑتی تھی جو میں پسند نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ میں نے اسے چھوڑ کر بجلی کمپنی میں ملازمت حاصل کی۔ یہیں سے میں نے اپنی موجودہ جدوجہد کا آغاز کیا۔ یہاں مزدوروں کی ایک اچھی خاصی یونین تھی۔ مگر میں اس بات سے واقف نہ تھا کہ یونین بنانے کا مقصد کیا ہوتا ہے۔ یہ بات تو جانتا تھا کہ مزدور اپنی یونین بناتے ہیں جلسے کرتے ہیں۔ جلوس نکالتے ہیں۔ مگر یہ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ اس سے میں واقف نہ تھا۔ جب مجھے اس یونین کا ممبر بننے کے لئے کہا گیا تو مجھے اس بات کی جستجو ہوئی کہ آخر یونین کا ممبر کیوں بنایا جاتا ہے؟ دو تین مزدوروں سے اس بارے میں معلوم کیا تو پتہ چلا کہ یہ یونین مسلمان مزدوروں کو نکالنے کا ایک ذریعہ ہے۔ یونین ہندوؤں کی ہے۔ وہ مسلمانوں کو اسکا ممبر بناتے ہیں۔ اس کے بعد کمپنی کے منتظمین یونین کے مسلمان ورکروں کو نکال دیا کرتے ہیں۔ یہ جان کر میں نے یونین کا ممبر بننے سے انکار کردیا۔ بعد میں یونین کے ایک سرگرم کارکن فاروقی صاحب نے مجھے بتایا کہ ہندو اور مسلم کی تفریق پیدا کرنے والے انتظامیہ کے چیچے ہیں اور یونین کی تنظیم کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے میرے بہت سے سوالوں کا جواب دیا۔ اور عام شکوک میرے دل سے دور کر دیئے تب کہیں میں یونین کا ممبر بنا اور جلسوں وغیرہ میں شریک ہونے لگا۔"

"تو اس کا مطلب ہے کہ "چھچھوف" نے آپ کے ذہن پر پہلا نقش قائم کیا۔"

"جی ہاں۔" انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا "مگر نقش اول سے نقش ثانی بہتر تھا۔ خیر! تو اسی زمانے میں خاکسار تحریک زوروں پر تھی۔ میں نے اس تحریک میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا۔ پھر جب ۱۹۴۲ء میں سبھاش چندر بوس کی سرکردگی میں "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک چلی تو ہم نے اس تحریک میں پوری تندہی سے کام کیا۔ انھیں دنوں میں مجھے گاؤں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں تحریک کے کام میں ایسا معروف ہوا کہ واپس دہلی نہ آسکا۔ گاؤں میں ہی کبھی لانڈری چلائی تو کبھی کسی ہوٹل میں منشی گیری کرکے گزارہ کرنے لگا۔ گاؤں میں مجھے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ میں نے اس فن کو اچھی طرح سیکھ لیا۔"

"کون سے فن کو۔؟" میں نے "فن" کے لفظ پر چونکتے ہوئے کہا۔

"ارے بھئی یہی فن منشی گیری —!" انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ کو نہیں معلوم یہ فن کس قدر منافع بخش اور کار آمد ہے۔ خیر چھوڑیئے اسے۔ ہاں تو۔ "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک کے سرگرم کارکنوں نے سہارنپور شاردا کے تین ریلوے اسٹیشن نذرِ آتش کر دیئے اور بہت اودھم بازی کی۔ ان ہی فارورڈ بلاک والوں نے جب نوجوانوں کی ایک تنظیم بنائی تو میں بھی اس میں شامل ہوگیا۔ ان سرپھرے نوجوانوں کا کام یہ تھا کہ مقامی سرکردہ لیڈروں کو پولس اور سی آئی ڈی کے متعلق نئے نئے حالات سے آگاہ کریں۔ صرف یہی نہیں۔ بلکہ ٹیلیفون کے تار کاٹیں، آگ لگائیں اور زیادہ کیا بتاؤں۔ آپ یوں سمجھ لیجئے کہ وہ سارے کام جن سے غیر ملکی ظالم حکومت کو نقصان پہنچ سکتا تھا اس جماعت کے اولین فرائض میں شامل تھے۔ میرا مکان محفوظ جگہ پر ہونے کی وجہ سے جماعت کے لیڈروں اور سرگرمیوں کا مرکز بنا رہا اور یہ سلسلہ ۱۹۴۴ء تک جاری رہا — پھر میں کوئٹہ چلا آیا۔ یہاں میں کچھ دن تو بیکار رہا پھر محکمۂ زراعت میں ملازمت مل گئی — اسی ملازمت کے دوران کوئٹہ میں پروفیسر آغا صادق اور راختر واحد وغیرہ نے ایک ادبی انجمن کی بنیاد رکھی۔ میں بھی اس انجمن میں شامل ہوگیا اور کچھ دن شاعری بھی کی اور افسانے لکھنے کی کوشش بھی کرتا رہا — آپ مسکرایئے نہیں۔ میں نے خود آخر میں یہ محسوس کر لیا کہ میں اور کچھ تو بن سکتا ہوں مگر ادیب نہیں بن سکتا۔"

اتنا کہنے کے بعد وہ اچانک کمرے سے اٹھ، کر چلے گئے۔ ان کا انتظار کرتے ہوئے میں نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کردیا۔ ایک پلنگ۔ دو کرسیاں ایک چھوٹی سی میز، دیوار پر ایک لکڑی کا تختہ لگا تھا جس پر ایک ٹائم پیس اور ایک آئینہ رکھا تھا۔ سامنے دیوار پر چھوٹی چھوٹی کیلوں پر کپڑے ٹنگے ہوئے تھے چھوٹی میز پر کتابوں، فائلوں اور کاغذات کا انبار لگا ہوا تھا۔ کونے میں ایک بڑا سا صندوق بھی تھا۔

"معاف کیجئے میں ذرا پان لینے چلا گیا تھا۔"

ابن ایوب صاحب کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "بغیر پان کے گزارہ نہیں ہوتا۔"

"آپ پان بہت کھاتے ہیں۔"

"لوگوں کا خیال ہے۔" انھوں نے کچھ اس انداز سے کہا گویا یہ حقیقت نہ ہو۔ مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی۔

"خیر تو میں کہہ رہا تھا کہ جب میں اس ادبی انجمن کے جلسوں میں شریک ہونے لگا تو کچھ اچھے اچھے اور قابل لوگوں سے بھی جان پہچان ہوگئی۔ پھر میں نے خود دوسرے اور ساتھیوں سے مل کر کوئٹہ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھی اور اسکی باقاعدہ نشستیں شروع ہوگئیں۔

ساتھ ساتھ میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ ہمارے محکمۂ زراعت میں حالات کار بہت ہی خراب تھے جیکا اسکا رخود میں بھی تھا۔ ان حالات کی بنا پر محکمے کے نچلے درجہ کے ملازمین میں کافی بے چینی تھی۔ تقریباً سب ہی اپنی اپنی جگہ یہ سوچتے تھے کہ ان حالات کے خلاف جدوجہد کی جائے۔ مگر سوال یہ تھا کہ بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے۔ میں نے اس سوال کا عملی جواب دینے کے لئے نچلے درجے کے ملازمین کی، یونین بنانے کی کوشش کی۔ لیکن جب منتظمین کو پتہ چلا تو انھوں نے میرا تبادلہ کوئٹہ سے لورالائی کردیا مگر وہاں پہنچتے ہی جب منتظمین نے طرح طرح سے پریشان کرنا شروع کیا تو میں نے ملازمت سے استعفیٰ دیدیا اور کوئٹہ آکر چند دن تو تلاش معاش میں سرگرداں رہا۔ آخر بڑی دوڑ دھوپ کے بعد کوئٹہ سے باہر ایک گاؤں میں جاکر سرکاری اسکول چلانے کی نوکری مل گئی۔ میں نے وہاں بڑی محنت اور جانفشانی اور فرض شناسی سے کام کیا۔ اور پندرہ دن کے اندر اندر اسکول کا افتتاح کردیا۔ اس محنت کا صلہ مجھے یہ ملا کہ مشکل سے دو تین دن بعد دوپہر کے وقت ایک صاحب جن کے نام سے میں آج تک واقف نہیں ہو سکا ہوں میرے پاس آئے اور مجھ سے تعارف حاصل کرنے کے بعد انھوں نے ایک پروانہ مجھے دے دیا جس میں صرف اتنا لکھا تھا کہ آپ کی جگہ ہم نے دوسرے ماسٹر صاحب کا تقرر کر دیا ہے آپ فوراً کوئٹہ آکر ہمیں اپنی کارکردگی کی رپورٹ دیں اور اور اپنا حساب لے جائیں۔"

اتنا کہنے کے بعد ابن ایوب صاحب ایک لمحے کے لئے خاموش ہوگئے۔ اور پھر کہنے لگے۔

"آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ مجھے اس بات

پر کس قدر غصہ آیا، میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا لیکن کر بھی کیا سکتا تھا۔ بحالت مجبوری کوئٹہ چلا آیا۔ یہاں آکر سر توڑ کوشش کی مگر ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ آخر رخت سفر باندھا اور راولپنڈی چلا گیا راولپنڈی میں بڑی مشکل سے پنجاب ٹرانسپورٹ میں بحیثیت کنڈکٹر ملازم ہو گیا۔ یہاں پر کچھ دن تو بڑی خاموشی سے کٹ گئے۔ مگر جب چند مزدوروں نے یونین بنانے کی کوشش شروع کی تو میں نے بھی ابتدائی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اپنے پچھلے تجربہ کی وجہ سے یہاں میری حیثیت ایک رہنما کی سی ہو گئی تھی جیسے ہی منتظمین کو ہماری سرگرمیوں کا پتہ چلا تو انھوں نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے جوشیلے اور سرگرم مزدوروں کو بلایا جن میں، بندہ شامل تھا۔ پہلے تو بہت سمجھاتے رہے کہ ہم اپنی حرکتوں سے باز آجائیں۔ مگر ہم کسی طرح راضی نہ ہوئے تو دھمکی دی کہ ہم ایک ایک کو جان سے ختم کر دیں گے۔ چونکہ ہم بہت جوش میں تھے یہ دھمکی بھی ہم پر کارگر نہ ہوئی۔ تو انھوں نے ہمیں رشوت کی پیش کش کی جس کو ہم سب نے ٹھکرا دیا اور اپنا کام اور تیز کر دیا۔ آخر منتظمین نے بہت سوچ بچار کے ساتھ، ان سب کو جو یونین بنانے میں پیش پیش تھے الگ الگ کر دیا۔ ہم میں سے کچھ ساتھیوں کو ترقی دے کر چیکر بنا دیا۔ کچھ کو بکنگ کلرک اور باقی تمام کو لمبے روٹ کی بسوں پر ڈال دیا۔ اس بات سے کچھ دن تو ہم کو کافی پریشانی ہوئی۔ مگر ہم نے بھی ہمت نہیں ہاری۔ بالآخر ہم نے یونین کی بنیاد رکھ ہی لی۔ کچھ دن بعد اس "جرم" کی پاداش میں ہم تمام ساتھیوں کو ملازمتوں سے برطرف کر دیا گیا۔ مجبوراً میں پھر کوئٹہ آ گیا۔ کوئٹہ میں کوئلے کی مختلف کانوں میں کام کیا۔ سب سے زیادہ عرصے ایچ ایم حبیب اللہ اینڈ کمپنی میں بکنگ کلرک کی حیثیت سے کام کیا۔ یہاں پر یونین تو تھی مگر بہت خراب حالت میں۔ بہرحال میں نے اس کے عہدے داروں کے ساتھ مل کر یونین کی تنظیم نو کی اور بڑی سرگرمی سے اس یونین کو بہتر بنانے کی کوشش شروع کر دی۔ میں نے بار بار کی شکستوں سے یہ بات سیکھی تھی کہ دوسری یونینوں سے بھی رابطہ قائم کیا جائے۔ لہٰذا جب میں نے یہ رابطہ قائم کر لیا تو اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ہمارے بہت سے مطالبات تسلیم کر لئے گئے اس وقت کے قانون کے مطابق ہم نے کافی سہولتیں حاصل کی تھیں۔ تحریک بہت زوروں پر تھی۔ مزدوروں میں بھی ٹریڈ یونین شعور پیدا ہو رہا تھا۔ یہ بات سرمایہ داروں کو پسند نہ تھی اور وہ اسکو خطرے کی گھنٹی تصور کرتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے اپنی عادت اور روایت کے مطابق اس بات کی کوشش شروع کر دی کہ یا تو مجھے جیل بھیجا جائے یا شہر بدر کیا جائے۔ پولس اور سی، آئی ڈی کے ذریعے میرے خاندان والوں پر دباؤ ڈالا جانے لگا۔ چونکہ میرے تمام عزیز و اقارب کوئٹہ میں بہت پہلے سے آباد اور بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں اس لئے یہ دھمکی کارگر ہوئی اور تمام عزیزوں نے ایک ساتھ ہلہ بول دیا۔ اگر میں قید ہو جاتا تو تمام کوئٹہ میں ان کی جھوٹی عزت خاک میں مل جاتی۔ مجھے تو خیر وہ کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔ مگر والدہ کو بہت پریشان کرتے تھے۔ اپنی والدہ اور اپنے سب سے بڑے محسن چچا زاد بھائی مولوی منیر احمد صاحب سابق وزیر اعظم قلات کی بات میں نہ ٹال سکا اور کوئٹہ چھوڑ کر خیرپور کے مقام گمبٹ چلا آیا۔ یہاں میں نے فقیر ٹیکسٹائل مل میں بحیثیت بلو روم کلرک ملازمت اختیار کی۔ شاید یہ ۵۴ء کی بات ہے — فقیر ٹیکسٹائل مل میں کام کرنا بڑے دل گردے کا کام تھا۔ یہاں پر مزدوروں سے جانوروں کی طرح کام لیا جاتا تھا۔ جتنی ذہنی تکلیف مجھے یہاں کے مزدوروں کی



... صبح کبھی تو آئے گی

حالت دیکھ کر ہوئی اتنی تکلیف مجھے اپنے والد کے انتقال پر بھی نہیں ہوئی تھی۔ محنت دوگنی، تنخواہ کم، بغیر کسی چھٹی کے مہینہ بھر کام کرنا پڑتا تھا۔ تنخواہ کا کوئی دن مقرر نہیں تھا۔ کھانے کے لئے کوئی وقفہ نہیں تھا اس پر طرّہ یہ کہ مل کے کام کے علاوہ مزدوروں کو انچارج کے گھر اور باہر کا دوسرا کام بھی کرنا پڑتا تھا۔ اس ظلم کو برداشت کرنا میرے بس کی بات نہ تھی، یہاں کے مزدوروں کو غنڈے جابروں کے ذریعہ بہت دبا کر رکھا جاتا تھا۔ ہر مزدور اپنے آپ کو چھری کے نیچے تصور کرتا تھا — ان حالات میں یونین بنانا تو بہت بڑی بات تھی۔ اس کے متعلق بات کرنا بھی جرم تھا۔ کچھ دن تو میں دل پر پتھر رکھے رہا۔ مگر کب تک؟

آخر ایک دن میں نے مل کے مفصل حالات پیکر نقوی کی ادارت میں سکھر سے نکلنے والے مزدوروں کے اخبار "رہنما" میں لکھ بھیجے۔ مراسلہ شائع ہوتے ہی مل میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اور مراسلہ نگار کی کھوج شروع ہوئی۔ میں مل میں شکور احمد کے نام سے ملازم تھا اور مراسلہ "ابن ایوب" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ لہٰذا کسی کو علم نہ ہو سکا۔ کچھ دن بعد میں نے ایک اور مراسلہ شائع کرایا جس میں مزدوروں کو یونین بنانے اور ظلم و زیادتی کے خلاف منظم جد و جہد کرنے کی ترغیب دی گئی تھی۔ ساتھ ہی میں نے اپنے ایک کلرک ساتھی کے تعاون سے مزدوروں کی یونین بنانے کی کوشش شروع کر دی۔ اس بات کا علم مل کے منتظمین کو فوراً ہو گیا۔ دوسرے دن جب ہم ڈیوٹی پر پہنچے تو لیبر آفیسر صاحب نے مجھے اور میرے ساتھی کلرک کو اپنے آفس میں بلایا۔ ابھی ہم۔ آفس کے دروازے میں پہنچے ہی تھے کہ لیبر آفیسر نے گالیوں کی بوچھاڑ شروع کر دی اور پانچ چھ غنڈے جو آفس میں پہلے سے موجود تھے ہم پر پل پڑے، ہمیں آفس میں کھینچ کر خوب پٹائی کی۔ سب سے وحشیانہ حرکت جو کی گئی۔ یہ تھی کہ ہمارے سر کے بال مونڈ دیئے گئے اور بہت سا تیل مل کر ہمیں آفس کے پیچھے چلچلاتی دھوپ میں کھڑا کر دیا گیا۔ اور حکم یہ تھا کہ اپنی جگہ سے ہلو بھی نہیں۔ دس بجے صبح سے بارہ بجے دوپہر تک ہم اس عذاب میں مبتلا رہے۔ آخر جب برداشت سے باہر ہو گیا تو ہم دونوں نے کچھ اور ہی ٹھان لی۔ اس وقت تک یہ ہو رہا تھا کہ پانچ پہرے دار تھے جو تھوڑی دیر کے بعد ہمارے نزدیک آتے اور اچھی طرح ہماری مرمت کرنے کے بعد دور جا کھڑے ہوتے۔ جب ایک بار وہ معمول کے مطابق فاتحانہ انداز میں مسکراتے ہوئے ہماری طرف آئے تو ہم طے شدہ پروگرام کے مطابق ان پر ٹوٹ پڑے اور زور زور سے شور مچانا شروع کر دیا۔ ہمارے اس غیر متوقع حملے سے وہ گھبرا گئے ادھر ہماری چیخ پکار سن کر مزدور بھی کھاتوں سے باہر نکل آئے۔ دو چوکیدار تو لیبر آفیسر کے کمرے میں گھس گئے باقی کو مزدوروں نے گھیر لیا اور پٹائی شروع کر دی۔ کچھ مزدور آفس میں گھس گئے کچھ نے بجلی بند کر دی اور یوں "آناً فاناً" اچھی خاصی ہڑتال ہو گئی۔ موقع اچھا تھا ہم نے فوراً ہی مزدوروں کو ایک جگہ جمع کر کے ایک کمیٹی بنا ڈالی اور منتظمین کے سامنے چار پانچ مطالبات رکھ دیئے۔ بگڑی ہوئی صورت حال کے پیش نظر مطالبات تو مان لئے گئے۔ مگر دو ہی دن بعد ہم دونوں کلرکوں کو اس چالاکی سے نکال دیا گیا کہ کسی مزدور کو خبر تک نہ ہو سکی۔

اس دفعہ بے روزگار ہو کر میں گمبٹ سے سکھر آ گیا۔ اور سب سے پہلے پیکر نقوی صاحب کے پاس گیا جو خود سکھر اور خیرپور کی مختلف یونینوں کے مشیر

قانونی تھے۔ انھوں نے بڑی خوشی سے مجھے اپنے اخبار میں لے لیا۔ ان کے ساتھ رہ کر میں نے بہت کچھ سیکھا۔ میں نے رکن الدین قاسمی صاحب اور اوسط جعفری صاحب کے ساتھ مل کر یعقوب بسکٹ فیکٹری ورکرز یونین، تانگہ ڈرائیور یونین۔ میونسپل ورکرز یونین اور سیمنٹ فیکٹری ورکرز یونین میں کام کیا اور بیڑی ورکرز یونین جو بالکل مردہ حالت میں تھی دوبارہ منظم کیا۔ ساتھ ساتھ اس زمانے میں کچھ دنوں تک روزنامہ "امروز" کا نامہ نگار بھی رہا ۱۹۵۸ء تک ہم سب ساتھی بڑی جانفشانی سے کام کرتے رہے۔ مزدوروں کے مطالبات کے لئے خوب خوب لڑے۔ ہڑتالیں کرائیں ان ہڑتالوں میں خیر ٹیکسٹائل مل کی ہڑتال زندگی بھر یاد رہے گی۔ ممتاز حسن قزلباش اس مل کے ڈائرکٹر اور وزیر صنعت بھی تھے۔ مشتاق احمد گورمانی مل کے حصّہ دار اور گورنر بھی تھے۔ اس مل میں اکیس دن ہڑتال ہوئی اور ہڑتال کے زمانے میں مزدوروں پر جو مظالم ہوئے وہ کیا بیان کئے جائیں بس یہ سمجھ لیجئے ؎

ہم نے سوچا تھا کہ حاکم سے کریں کے فریاد
وہ بھی کم بخت ترا چاہنے والا نکلا

آخر تنگ آکر ہم نے مزدوروں کا جلسہ عام کیا۔ اور ایک تاریخی فیصلہ کیا جسکے تحت اٹھائیس سو میں سے چوبیس سو مزدوروں نے مع بال بچوں نے اسی وقت گھر بار چھوڑ دیا۔ ہمارے اس فیصلے کا نتیجہ بہت شاندار رہا۔ دو ماہ بعد منتظمین نے مزدوروں کے تمام مطالبات اپنی طرف سے تسلیم کرنے کا نوٹس لگا دیا اور نکلے ہوئے مزدوروں کو دوبارہ کام پر لینا شروع کر دیا۔

۵۸ء میں بیڑی ورکرز نے اپنی تنخواہوں میں اضافے کے لئے ہڑتال کی جو تیس دن جاری رہی ہڑتال کے بائیس ویں دن مجھے مداخلت بیجا کے جھوٹے الزام میں گرفتار کر لیا گیا اور آٹھ دن بعد ضمانت پر رہا کیا گیا اس کے بعد بڑا بھیانک دور آیا۔ اکتوبر ۵۸ء میں مارشل لاء نافذ ہوا اور مزدور تحریک بھی اسکی زد میں آئی۔ ہمارا یونین آفس سیل کر دیا گیا۔ اور بچّو نقوی گرفتار کر لئے گئے۔ مزدوروں میں بے دلی اور افراتفری پھیل گئی دو سال تو عذاب زباں بندی میں مبتلا رہے

آخر جب بین الاقوامی مزدور تحریک I.C.F.T.U. کی کوششوں سے مزدوروں کو کچھ آزادی ملی تو ہم نے دوبارہ کام شروع کیا۔ یونینوں کو منظم کیا۔ کوٹری ورکرز یونین کے ایک لاکھ روپے ٹھیکیدار نے غبن کر لئے تھے ہم نے اسکی واپسی کی جدوجہد کی تو مجھے اور نو دوسرے ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا اور ضمانت کی کوشش بھی کامیاب نہ ہونے دی گئی۔ حالت یہ تھی کہ کوئی وکیل بھی میرا کیس۔ مارشل لا کے خوف سے لینے کو تیار نہ ہوتا تھا۔ بہرحال یہاں سے چھٹکارا ملا تو ۱۹۶۱ء میں کراچی چلا آیا۔ یہاں کچھ عرصے "خاتون پاکستان" میں ملازمت کی پھر حسین ٹیکسٹائل مل میں بھرتی ہوا۔ وہاں سے آدم جی کاٹن ملز ایمپلائز یونین کے آفس سیکریٹری کی ذمہ داری سنبھالی۔ مل چھوڑی اور یونین کے تنظیم کے کام میں منہمک ہوگیا۔ آدم جی ملز کی چمچہ یونین کو شکست دی اور لانڈھی کے علاقے میں کئی ملوں میں کامیاب ہڑتالیں کرائیں۔ کئی ملوں میں نئی یونینیں قائم کیں۔ ان سرگرمیوں کے دوران مجھ پر انڈسٹریل ڈسپیوٹ آرڈیننس کی دفعات ۲۳ء۔ اور ۲۴ء کے تحت جھوٹا فوجداری مقدمہ قائم کر دیا گیا۔ تاکہ مجھے کسی طرح سزا یا جرمانہ کرا کے تین سال کے لئے ٹریڈ یونین سرگرمیوں سے روکا جا سکے۔ یہ اسکیم کامیاب رہی۔ مجھے اور ساتھیوں کو تین ماہ قید سخت اور ایک سو روپے جرمانہ کی سزا ہوئی۔

آخر اپیل کرنے پر نومبر ۶۴ء میں سیشن کورٹ نے ہمیں باعزت بری کر دیا۔ اس سے پہلے یکم مارچ ۶۳ء کو اور پھر دو ماہ بعد مئی ۶۳ء میں بھی مجھے قید رکھا گیا تھا مگر آخری گرفتاری بہت اذیت ناک تھی۔ جیل کی اذیتوں کی بنا پر مجھے عرق النساء کی تکلیف ہو گئی جس نے ابھی تک میرا پیچھا نہیں چھوڑا ہے۔"

"آپ کی آپ بیتی میں گھر بار کا ذکر بالکل نہیں آیا۔" میں نے ابن ایوب صاحب کو توجہ دلائی۔

"ہاں یہ بات بہت ضروری ہے۔ انھوں نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔" میری شادی ۵۴ء میں ہوئی تھی۔ جب مجھے کوئٹہ سے دھکے دے کر اعزا نے سکھر بھیجا تھا تو وہیں یہ خوشگوار حادثہ پیش آیا۔ میری مسلسل جدوجہد میں میری بیوی بھی برابر کی شریک رہی ہیں۔ شادی کے کچھ دن بعد ہی انھوں نے اسکول ٹیچر کی حیثیت سے ملازمت کر لی تھی۔ انھوں نے ہر ہر مرحلے پر میرا ساتھ دیا



۶۲ء میں ٹریڈ یونین انسٹرکٹرز کی ایک ٹریننگ کلاس

میونسپل ورکرز یونین سکھر کی مجلس عاملہ





ستمبر ۵۸ء میں بیڑی ورکرز کے ساتھ

اور پریشانیوں میں میری ہمت بڑھائی۔ وہ میری بیوی بھی ہیں اور محسن اور دوست بھی۔

"کیا پریشانیوں میں آپکو تحریک چھوڑ کر اپنے بال بچوں کے ساتھ پرسکون زندگی گزارنے کا خیال نہیں آیا ۔۔؟"

"کیسے آسکتا تھا؟" انھوں نے الٹا سوال داغ دیا "اس معاشرے میں جسکی بنیاد لوٹ کھسوٹ پر ہے متوسط طبقے کا آدمی تنہا زندگی نہیں گزار سکتا۔ اگر تنخواہوں میں تھوڑا بہت اضافہ ہوتا ہے تو دوسری طرف کارخانہ دار اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ کر دیتے ہیں اور صورتحال وہی رہتی ہے اسی کا مقابلہ کرنے کے لئے اجتماعی جدوجہد لازمی ہے۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ پریشانیوں میں ہمیشہ میرے مزدور ساتھیوں نے میری پوری مدد کی اور مجھے کبھی تنہا رہ جانے کا احساس ہی نہیں ہوا"

"موجودہ لیبر قوانین کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے"

"اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ انگریز سامراج کے دور میں مزدوروں کو آج سے زیادہ حقوق حاصل تھے اور وہ آزادی کے ساتھ اپنے حقوق کے لئے جدوجہد کر سکتے تھے۔ ان ہی قوانین کا سہارا لے کر مزدوروں نے جدوجہد آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انگریز سامراج کو ہندوستان سے بھگانے میں مزدوروں کا بڑا ہاتھ ہے۔ اگر مزدور عوامی تحریکوں میں کانگریس اور مسلم لیگ کی آواز پر لبیک نہ کہتے تو ہمارے گلے میں آج بھی انگریزوں کی غلامی کا طوق ہوتا"

"کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ پاکستان کے مزدوروں میں ابھی تک ٹریڈ یونین شعور پیدا نہیں ہوا۔ آپ کا کیا خیال ہے ۔۔؟"

"یہ خیال ایک حد تک درست ہے" انھوں نے سوچتے ہوئے کہا "خصوصاً ٹیکسٹائل ملوں کے مزدوروں میں آج تک ٹریڈ یونین شعور پیدا نہیں ہو سکا اسکی کئی وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان ملوں کے بیشتر مزدور دراصل کسان ہیں جو یا تو فالتو سیزن میں شہر آ کر مزدوری کرتے ہیں اور فصلوں کے وقت واپس چلے جاتے ہیں یا اپنی رہن رکھی ہوئی زمین چھڑانے کے لئے یہاں مزدوری کر کے پیسے جمع کرنے کی فکر میں رہتے ہیں اور کچھ اپنی زمینوں میں اضافہ کرنے کی نیت سے ملوں میں وقتی طور پر کام کر کے پیسہ حاصل کرتے ہیں۔

ان سب لوگوں کو حالات کا بہتر بنانے کی جدوجہد سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔

دوسری بنیادی وجہ یہ ہے کہ تحریک میں جو لیڈر شپ ابھر کر آتی ہے اس میں ۸۰ فیصد مزدور لیڈر سرمایہ داروں کے ایجنٹ، ابن الوقت اور انتہائی مفاد پرست ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور بات قابل ذکر ہے۔ وہ یہ کہ ہمارے ملک کا سرمایہ دار دراصل "دلال سرمایہ دار" ہے جو غیر ملکی سرمایہ داروں کے زیر سایہ پرورش پا رہا ہے اور اپنے انہی آقاؤں کے نقش قدم پر چل رہا ہے اس لئے وہ ملک میں صحیح لیڈر شپ کو ابھرنے ہی نہیں دیتا۔ اگر کہیں کوئی چنگاری راکھ کے ڈھیر میں سے نکلتی ہے تو وہ اپنی پوری طاقت صرف کر کے اس کو مسل ڈالتا ہے اس لئے کہ سارے قوانین اس کے اپنے بنائے ہوئے ہیں جن کا استعمال اس کو اچھی طرح معلوم ہے۔ اور اسے ان قوانین کو استعمال کرنے کے حق سے روکنے والا کوئی نہیں ۔۔۔!"

"آپ نے لانڈھی کے حالات بہت ہی مختصر بتائے"

"جی ہاں۔ حالانکہ سب سے زیادہ مجھے لانڈھی ہی میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ابھی میں لانڈھی میں معہ اپنے ساتھیوں کے ان ناانصافیوں کے خلاف برسرِپیکار ہوں اس لئے ممکن نہیں کہ تفصیلی حالات بتا سکوں ۔۔۔ اس وقت میں لانڈھی کی سات یونینوں میں کام کر رہا ہوں جن میں سے چار رجسٹرڈ ہیں اور تین رجسٹریشن کی کارروائی کے مراحل طے کر رہی ہیں"

یکایک گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے انھوں نے کہا "میرا خیال ہے وقت بہت زیادہ ہو گیا ہے۔ اور صبح مجھے انڈسٹریل کورٹ بھی جانا ہے۔ جہاں سرمایہ داروں کے بنائے ہوئے جانبدارانہ قوانین کے ذریعے مزدوروں کے حقوق حاصل کرنے کے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں"

انکی رحم طلب نگاہوں سے متاثر ہو کر میں اٹھ کھڑا ہوا اور رخصت ہونے کے بعد بھی دیر تک اس دبلے پتلے اور بظاہر کمزور نظر آنے والے شخص کے متعلق سوچتا رہا کہ اس کو کچلنے میں سرمایہ داروں کی شاطرانہ چالیں اور حکومت کی ظالم مشینری بھی کامیاب نہ ہو سکی تھی اور جو اپنے منحنی سے جسم کے ساتھ استبداد کے "دیو" سے مقابلے پر ڈٹا ہوا ہے۔ جسکی بے خوف اور پرعزم مسکراہٹ دوسروں کو بھی حوصلہ اور ولولہ عطا کر رہی تھی اور جو محنت کی عظمت منوانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے بے خطر آتشِ نمرود میں کود پڑا تھا۔



بہارِ حسن کیلئے بہار کا تحفہ
JAN-E-SABA
TRANSPARENT
جانِ صبا ٹرانسپیرنٹ سوپ
SPLENDID

قمر اقبال

اِن دِنوں......

اِن دِنوں ہموار راہوں سے ہے قدموں کو گریز
اِن دِنوں بھاتا نہیں آسان رستوں کا سفر
اِن دِنوں پیروں کو سرکش گھاٹیوں سے عشق ہے
اِن دِنوں الجھے ہوئے بالوں میں ہے گرد و غبار
اِن دنوں ہے ٹھوکروں میں بھی عجب کیف و سرور
اِن دِنوں آنکھوں میں ہے وحشت کے سورج کی تپش
اِن دِنوں سیاحیِ دشت و جبل کا ہے جنوں!
اِن دِنوں تپتے ہوئے صحرا میں پھرنے کا ہے شوق
اِن دِنوں تیشہ ہے زیبِ دست، پیشِ چشم کوہ
اِن دِنوں چٹان زیرِ پا ہے، فرشِ گل کہاں
اِن دنوں اُن پُرخطر راہوں کی ہے مجھ کو تلاش
ہر قدم پہ خیر مقدم کر سکیں کانٹے جہاں

اِن دنوں کچھ اور ہے ماحولِ شہرِ زندگی!
اِن دنوں قندیلِ ماضی کوئی دکھلاتا نہیں
اِن دنوں شعلہ کوئی دامن کو چھو پاتا نہیں
اِن دنوں دہلیز تک دل کی کوئی آتا نہیں



اشتیاق طالب

ظلم کے شعلے گلستاں میں بھڑکتے ہی رہے
ہم کہ پھولوں کی طرح پھر بھی مہکتے ہی رہے

ظلمتوں کے رقص، یخ بستہ فضا کے باوجود
دامنِ شب پر ستارے کچھ چمکتے ہی رہے

نفرتوں کی گرد کے اٹھتے رہے طوفاں ہزار
دامنِ دل ہم مگر اپنا جھٹکتے ہی رہے

جیسے صحرا میں بگولے جیسے گلشن میں صبا
جستجو میں آپ ہم اپنی بھٹکتے ہی رہے

کوئی یہ دیکھے کہ ہم ترکِ وفا کے باوجود
صورتِ دل اس کے پہلو میں دھڑکتے ہی رہے

مزدور طبقے کی نجات شہید ساتھیوں کے نقشِ قدم پر چلنے میں ہے

کراچی کے مزدوروں کی طرف سے یکم مارچ کے شہیدوں کو خراجِ عقیدت

کراچی (نمائندہ منشور) کراچی کے مزدوروں نے یکم مارچ کے شہیدوں کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا۔ ٹریڈ یونینوں کی مجلس رابطہ کے سابقہ فیصلوں کے مطابق مجلس رابطہ کی طرف سے سارے شہر میں پوسٹر چسپاں کئے گئے اور ہینڈ بل تقسیم ہوئے ان پوسٹروں اور ہینڈ بلز میں یکم مارچ کو ایک یادگار دن کے طور پر منانے کی اہمیت کی وضاحت کی گئی تھی اور ان محرکات کا جائزہ لیا گیا تھا جو اس عظیم سانحہ کا باعث ہوئے۔ شہر کے مختلف علاقوں میں مزدور یونینوں کے دفتروں پر سیاہ پرچم لہرائے گئے اور مزدوروں نے اپنے شہید ساتھیوں کی یاد میں بازوؤں پر سیاہ پٹیاں باندھیں۔ مختلف مزدور انجمنوں کی طرف سے مختلف مقامات پر عام جلسے منعقد کرنے کی اجازت لینے کی درخواستیں کافی عرصہ قبل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کراچی کو پیش کر دی گئی تھیں لیکن کسی بھی درخواست پر اجازت نہ ملی — یکم مارچ کی شام کو مجلس رابطہ کے دفتر واقع ولایت آباد منگھوپیر روڈ مزدور کارکنوں کا ایک اجلاس زیر صدارت چچا علی جان منعقد ہوا۔ اجلاس میں لانڈھی۔ ملیر ایئرپورٹ۔ منگھوپیر روڈ۔ شیر شاہ۔ ڈاکیارڈ کیماڑی اور منوڑا کے مزدور کارکنوں نے شرکت کی۔ جلسے میں۔ گل محمد۔ بشیر احمد۔ محمد جعفر۔ محمد شریف یوسف خاں۔ فہیم الدین۔ ستار حسین۔ غیاث الدین حاجی عدیل۔ ذکی عباس۔ اور واحد بشیر نے تقریریں کیں۔ مقررین نے حالات کا تفصیل سے جائزہ لیا۔ جنھوں نے کراچی کے مزدوروں کو عام ہڑتال پر مجبور کیا۔ انھوں نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ حکومت نے اس سانحے کی تحقیقات کے لئے ہائی کورٹ کے جج کی نگرانی میں باقاعدہ تحقیقات نہ کروائی جسکا وعدہ کیا گیا تھا۔ بلکہ انتظامیہ کے ایک فرد کو یہ کام سونپا گیا۔ لیکن دو برس گزرنے کے باوجود آج تک وہ تحقیقاتی رپورٹ بھی شائع نہیں کی گئی۔ مقررین نے اس بات کی مذمت کی کہ شہید ہونے والے ساتھیوں کے عزیزوں اور دوستوں کو کراچی چھوڑنے پر مجبور کیا گیا اور آج ان میں سے کسی ایک کا بھی پتہ چلنا ناممکن ہے یہی صورت حال زخمیوں کے ساتھ پیش آئی وہ زخمی جو معاوضے کی توقع میں یونین کے دفتروں کے چکر لگاتے تھے اچانک غائب ہو گئے اور اب باوجود تلاش کے ان کا پتہ چلنا ممکن نہیں۔ مقررین نے اس بات پر زور دیا کہ اگر مل مالکان معقول رویہ اختیار کرتے اور حکومت انکی بے جا حمایت نہ کرتی تو حالات اس حد تک نہ بگڑتے۔ انھوں نے اس یقین کا اظہار کیا کہ اگر مل مالکوں نے مزدوروں کے ساتھ اپنا رویہ وہی رکھا جسکا مظاہرہ انھوں نے یکم مارچ ۶۳ء سے پہلے کیا تھا تو پھر ایسے ہی حالات پیدا ہو سکتے ہیں — انھوں نے اس بات کی شدید مذمت کی کہ حکومت اور خاص طور پر محکمۂ محنت نے مخلص اور بے باک ٹریڈ یونینوں کے ساتھ سوتیلی ماں کا سا رویہ اختیار کر رکھا ہے۔ مزدوروں میں انکے وقار کو ختم کرنے کے لئے ان کارروائیوں سے بھی گریز کیا جاتا ہے جو رائج قانون کے تحت انکی ذمہ داری۔ زیر زبر کی خامیاں تلاش کر کے انکی رجسٹریشن کی درخواستیں مسترد کر دی جاتی ہیں۔ انھوں نے متنبہ کیا کہ اس قسم کی حرکات سے نہ تو ٹریڈ یونین تحریک ختم ہو سکتی ہے۔ نہ ہی ایماندار کارکنوں پر سے مزدوروں کا اعتماد ختم ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ نتیجہ ضرور نکلے گا کہ مزدوروں کا اعتماد محکمۂ محنت اور حکومت پر سے اٹھ جائے گا اور وہ انھیں مل مالکوں کا آلۂ کار سمجھنے پر مجبور ہوں گے۔

تمام مقررین نے یکم مارچ کے شہیدوں کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا اور مزدوروں سے درخواست کی کہ وہ اس تحریک کو آگے بڑھانے میں تن من دھن کی بازی لگا دیں جسکے لئے ہمارے ساتھیوں نے جان جیسی عزیز چیز قربان کر دی — مزدوروں کو آج تک کوئی حق بغیر قربانی دیئے حاصل نہیں ہوا۔ اس لئے وہ لوگ جو محنت کش طبقے کے لئے بہتر زندگی کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں انھیں سب سے پہلے خود کو قربانیوں کے لئے تیار کرنا پڑے گا۔ اسی میں مزدور طبقے کی نجات ہے۔

حسین ٹیکسٹائل لیبر یونین کا اجلاس

لانڈھی (نمائندہ منشور) آج یہاں حسین ٹیکسٹائل ملز لیبر یونین کی مجلس عاملہ کے اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ منتظمین نے آجکل مزدوروں کے ساتھ جو رویہ اختیار کر رکھا ہے اس کے خلاف جلد از جلد اقدام کیا جائے یونین کے جنرل سیکریٹری مسٹر یوسف خاں یوسف زئی نے ممبران کو بتایا کہ گزشتہ دو ماہ سے لاتعداد ممبران نے تحریری طور پر یونین سے یہ شکایت کی ہے کہ منتظمین نے اخراجات اور تیار ہونے والے کپڑے پر فی گز لاگت کم کرنے کی جو مہم شروع کر رکھی ہے۔ اس سے نہ صرف مزدوروں پر کام کا بوجھ بڑھ گیا ہے بلکہ بعض واقعات میں یہ بات بھیانک ظلم کی حد تک تجاوز کر گئی ہے۔ موصوف نے بتایا کہ رنگ ڈیپارٹمنٹ میں سنگل سائنڈروں کی آسامی بالکل ختم کر دی گئی ہیں اور تھری، فور اور چھ سائنڈر بنا کر انھیں اس قدر کم اجرت دی جا رہی ہے جو کسی طرح بھی اس محنت کی قیمت نہیں کہی جا سکتی۔ جو وہ کرتے ہیں نیز تمام کھاتوں میں زبردست چھانٹی اور رد و بدل کی جا رہی ہے جہاں پہلے چار کاریگر یا ڈافر کام کرتے تھے وہاں صرف ایک آدمی سے کام نکالنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس سلسلے میں مزدوروں کو مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ اگر کام کرنا چاہتے ہیں تو انھیں اپنا ٹریڈ چھوڑنا پڑے گا۔ اس کی وجہ سے — مزدوروں کو مالی نقصان برداشت کرنے پڑ رہے ہیں بدلی ورکرز کو مسلسل ۱۲–۱۲ روز تک واپس کیا جا رہا ہے — اس رپورٹ کے بعد مجلس عاملہ نے ایک سہ نفری کمیٹی تشکیل دی ہے جو مزید، حالات کا جائزہ لے کر ایک ہفتہ کے اندر لائحۂ عمل مجلس عاملہ کے سامنے تجویز کرے گی نیز مطالبات بھی جمع کرے گی تاکہ ان پر آئندہ اقدامات کا فیصلہ کیا جا سکے۔

گیس اینڈ الیکٹرک اپلائنسز لمیٹڈ کے مزدوروں اور منتظمین کے درمیان معاہدہ ہو گیا

کراچی (نمائندہ منشور) گیس اینڈ الیکٹرک اپلائنسز کے مزدوروں نے جنوری کے آخری ہفتہ میں پانچ، منتخب نمائندوں کے ذریعہ اپنے مطالبات کے سلسلے میں ہڑتال کا نوٹس دیا تھا۔ فروری میں مشترکہ، مٹنگ میں ڈپٹی ڈائرکٹر لیبر ویلفیئر مسٹر این۔ اے تالپور کے مشورے پر دوسری مٹنگ دو مارچ ۱۹۶۵ء تک ملتوی کردی گئی تھی ۲ رمارچ کی مشترکہ مٹنگ میں مصالحتی افسر مسٹر تالپور کی مخلصانہ کوششوں اور منتظمین اور مزدوروں کے معقول رویے کی وجہہ سے منتظمین اور مزدوروں میں معاہدہ ہوگیا ہے۔ معاہدہ کی چند شرائط حسب ذیل ہیں۔

۱:۔ چھٹیاں :

منتظمین مزدوروں کو دس دن کی سالانہ حق رضا کے علاوہ آدھی تنخواہ پر دس دن کی رخصت بیماری۔ بغیر تنخواہ دس دن کی رخصت اتفاقی۔ اور معقول وجوہات کی بنا پر دو ماہ کی بغیر تنخواہ کی چھٹی ہر سال دیں گے۔

۲:۔ کم از کم اجرت :

منتظمین ہر غیر ہنر مند مزدور کو ملازمت کے تین ماہ کی تکمیل کے بعد کم از کم تین روپے یومیہ، مزدوری دیں گے۔

۳:۔ کینٹین :

منتظمین کینٹین کے لئے جگہ، برتن، گیس — ایکیکٹرک اور پانی بلا معاوضہ مہیا کریں گے اور، ٹھیکیدار مزدوروں کے مشورے سے مقرّر کیا جائے گا۔

۴:۔ وردیاں :

منتظمین نے وعدہ کیا کہ وہ مزدوروں کو انکے کام کی نوعیت کے مطابق مکمل وردیاں یا ایپرن مہیّا کریں گے۔ اس کے علاوہ ان تمام مزدوروں کو وردیاں دی جائیں گی جنکے متعلق فیکٹری انسپکٹر مشورہ دے۔

۵:۔ ملازمت کا تحفظ :

کسی بھی مزدور کو بے قصور نہیں نکالا جائیگا اگر مزدور سے قصور سرزد ہو تو اسے باقاعدہ چارج شیٹ دی جائے گی اور انکوائری کی جائے گی۔

۶:۔ درجہ بندی اور سالانہ ترقی :

منتظمین نے اس امر سے اتفاق کیا کہ تمام ملازمین کی انکے کام کی نوعیت کے مطابق درجہ بندی کی جائے۔ اس درجہ بندی کے مطابق انکی تنخواہوں کے اسکیل مقرر کیئے جائیں اور سالانہ ترقی کی شرح کا تعین کیا جائے۔ چونکہ یہ معاملہ تفصیل طلب ہے۔ اس لئے منتظمین نے دو ماہ کی مہلت طلب کی ہے۔ لیکن نئے اسکیل اور سالانہ ترقی کا اطلاق یکم جنوری ۱۹۶۵ء سے ہوگا۔

۷:۔ اعلیٰ اسامی پر ترقی :

منتظمین نے یہ بات مان لی کہ اگر کوئی اعلیٰ اسامی خالی ہو یا نئی اسامی نکلے تو اس پر پرانے مزدوروں میں سے سروس اور اہلیت کی بنا پر ترقی دی جائے۔

۸:۔ منتظمین نے ڈبل اوور ٹائم دینا منظور کر لیا ہے۔

معاہدے پر منتظمین کی طرف سے منیجنگ ڈائرکٹر مسٹر مرچنٹ اور مزدوروں کی طرف سے ان کے پانچ منتخب نمائندوں عبدالسلیم۔ نسیم الدین۔ محمد شفیع بھٹی۔ فہیم الدین اور واحد بشیر نے دستخط کئے۔ یہ معاہدہ ایک سال کے لئے نافذ رہے گا۔

ایسٹرن فیڈرل کے محنت کشوں کا احتجاج

ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس ورکرز یونین تقریباً ایک ماہ سے احتجاجی بلے لگا کر انتظامیہ کی مزدور کش پالیسیوں کی مذمت کر رہی ہے۔ لیکن انتظامیہ نے کارکنان کی مشکلات پر کوئی توجہ نہیں دی جسکے نتیجہ میں یونین نے چند دنوں سے پلے کارڈز اور بینرز کے ذریعہ احتجاج کا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔ یونین کے نمائندوں نے ہمارے نمائندے کو بتایا کہ اگر انتظامیہ نے اپنا رویہ تبدیل نہ کیا تو یونین کے اراکین بہت جلد سخت اور موثر قدم اٹھائیں گے۔ یونین نے اپنی برانچوں کو ہدایات جاری کر دی ہیں کہ وہ بھی جد وجہد کا آغاز کر دیں۔

یاد رہے کہ کمپنی نے ۱۹۶۴ء میں ۲۷ کروڑ کا بزنس کیا ہے اس کے باوجود اپنے، ملازمین کے مطالبات کے سلسلے میں منتظمین ٹال مٹول کر رہے ہیں۔

نیشنل بنک اسٹاف یونین کی طرف سے بونس میں اضافے کیلئے احتجاج اور مظاہرے

کراچی (نمائندہ منشور) پچھلے دنوں نیشنل بنک آف پاکستان کے منیجنگ ڈائرکٹر نے بنک کا سالانہ گوشوارہ پیش کیا اور اعلان کیا کہ ختم ہونے والے سال میں بنک کے منافع میں اضافہ ہوا ہے اس کے ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی اعلان کیا کہ بنک اپنے ملازمین کو دی جانے والی سہولتوں میں کوئی اضافہ نہیں کر رہا ہے۔ اور بونس کی شرح بھی وہی رہے گی اس کھلی ہوئی ناانصافی کے خلاف اسٹاف میں کافی غم وغصہ پایا جاتا ہے۔ اپنے انھیں جذبات کا مظاہرہ کرنے کے لئے یونین نے احتجاج کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ کئی دن سے دفتر کے اوقات کے بعد ملازمین صدر دفتر کے احاطے میں جمع ہو کر جلسہ کرتے ہیں۔ بونس میں اضافے کے نعرے لگاتے ہیں دھاندلی اور چمچہ گیری کے خلاف نعرے لگاتے ہیں اور اسکی مذمت کرتے ہیں نمائندہ منشور کو معلوم ہوا ہے کہ فیڈریشن آف بنک ایمپلائز یونینز کا ایک جلسہ بلایا جانے والا ہے جس میں نیشنل بنک آف پاکستان اور مسلم کمرشیل بنک کے ملازمین کے مطالبات کے سلسلے میں غور کیا جائے گا۔

باوانی وائلن ٹیکسٹائل ملز سے بوڑھے مزدوروں کی برطرفی

کراچی (نمائندہ منشور) باوانی وائلن ٹیکسٹائل ملز کی انتظامیہ نے تمام بوڑھے مزدوروں کو ملازمت سے برخواست کر دیا ہے۔ یہ مزدور انتہائی تجربہ کار مزدور ہیں اور بیس پچیس برس سے ملوں میں کام کر رہے ہیں بوڑھے ہونے کے باوجود انکے کام میں کسی طرح کی خرابی نہیں تھی۔ نہ ہی نوجوان کاریگروں کے مقابلے میں ان کا، پروڈکشن کم تھا۔ اس کا ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے کہ ان مزدوروں کو نہ تو وارننگ دی گئی نہ ہی چارج شیٹ۔ مزدور یونین پچھلے کئی سالوں سے دفعہ ۱۲ کے خلاف آواز اٹھا رہی ہے۔ لیکن یہ دفعہ ابھی تک

خبرنامہ

برقرار ہے اس دفعہ کے تحت مل مالک کو اختیار حاصل ہے کہ وہ کسی بھی ملازم کو بلا کسی قصور جس وقت چاہے نوٹس دے کر برخاست کر سکتا ہے۔ ان ضعیف مزدوروں نے نمائندہ منشور کو بتایا کہ اب انکے لئے روزگار حاصل کرنا انتہائی مشکل ہے۔ کیونکہ جس مل میں انھوں نے آٹھ آٹھ دس دس برس کام کیا ہے۔ وہی مل جب انکو کام دینے پر تیار نہیں تو دوسرا کوئی مل کب انھیں ملازم رکھے گا۔ دوسری مشکل یہ ہے کہ ٹیکسٹائل ملز سے آئے دن مزدوروں کو نکالا جاتا رہتا ہے جسکی وجہ سے نوجوان مزدور تقریباً ہر مل کے گیٹ پر بھرتی ہونے کے انتظار میں کھڑے ہوئے ملتے ہیں۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ نوجوان مزدور کو ترجیح ملے گی انھوں نے بتایا کہ یہ تمام باتیں وہ انتظامیہ کے سامنے رکھ چکے ہیں لیکن وہ کوئی بات سننے کو تیار نہیں ہیں — اس واقعے سے عام مزدوروں میں بڑی بے چینی پائی جاتی ہے۔ اور وہ اپنے غیر محفوظ مستقبل کی طرف انتہائی فکرمند ہیں۔

یہ سنہ ۱۹۶۵ء ہے؟

کراچی (نمائندہ منشور) "مزدوروں کے حالاتِ کار کو دیکھتے ہوئے یہ سوچنا پڑتا ہے کہ یہ سنہ ۱۹۶۵ء ہے یا سنہ ۱۵۶۵ء" یہ بات مجلس رابطہ قائم مقام سیکریٹری جنرل واحد بشیر نے نمائندہ منشور سے ایک ملاقات میں کہی اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ ایک مزدور صابر علی نے مجلس رابطہ سے امداد کی درخواست کرتے ہوئے بتایا کہ وہ ۹ مارچ سنہ ۶۵ء کو جامعہ ٹیکسٹائل ملز واقع سندھ انڈسٹریل ایریا ٹریڈنگ اسٹیٹ میں بحیثیت ڈافر بھرتی ہوا ۱۲ مارچ تک اس نے اپنا کام انتہائی خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ ۱۳ مارچ کو جب کہ وہ اپنے کام میں مصروف تھا مل مالک جناب انعام صاحب اس کے پاس آکر کھڑے ہو گئے جس کی وجہ سے کام سے اسکی توجہ ہٹ گئی اور اس نے بے خیالی میں بابن پہ دوہرا لپیٹا لگا دیا۔ یہ دیکھتے ہی سیٹھ صاحب نے اسے گریبان سے پکڑا اور دو تین چانٹے رسید کر دیئے۔ اس کے احتجاج کرنے پر سیٹھ صاحب نے جابر کے ہاتھ سے بیدلے کر تین چار بیدیں رسید کیں اور اسے کھاتے سے باہر نکال دیا۔ اس کے بعد صابر علی آفس میں گیا اور اس نے درخواست کی کہ اسکی چار دن کی مزدوری ادا کر دی جائے جسمیں اس کا ۱۳ تاریخ کا کام شامل نہیں تھا۔ اس پر اس سے کہا گیا کہ چونکہ اس نے کام میں غلطی کی ہے لہٰذا اسکی مزدوری بحق کارخانہ ضبط کر لی گئی ہے۔ صابر علی نے جواب دیا کہ مل مالک کو ایسا کرنے کا کوئی قانونی حق حاصل نہیں ہے اس پر چوکیدار کو بلوا کر حکم دیا گیا کہ اسے گردن سے پکڑ کر مل سے باہر نکال دیا جائے۔ چوکیدار نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے مذکورہ مزدور کو گردن سے پکڑ کر دھکے دیتے ہوئے گیٹ سے باہر نکال دیا۔

چونکہ صابر علی ایک غریب مزدور ہے جو ابھی پنجاب سے آیا ہے۔ اس میں اتنی سکت نہیں کہ کوئی قانونی چارہ جوئی کر سکے۔ اور نہ ہی اسے توقع ہے کہ کھاتے کے دوسرے مزدور اپنے روزگار کو خطرے میں ڈال کر مل مالک کے خلاف گواہی دیں۔ اس لئے اس نے مجلس رابطہ سے درخواست کی ہے۔

فوری اقدام کے طور پر مجلس رابطہ نے صابر علی کی درخواست اسسٹنٹ ڈائرکٹر لیبر ویلفیئر (انسپکشن) کو پہنچا دی ہے۔ اور اس درخواست پر کاروائی کی منتظر ہے۔

ٹیکسٹائل ملوں سے مزدوروں کے اخراج کا سلسلہ

کراچی (نمائندہ منشور) کراچی کے ٹیکسٹائل ملوں کے منتظمین آہستہ آہستہ پھر ایسے حالات پیدا کرتے جا رہے ہیں جو مارچ سنہ ۶۳ء سے پہلے پیدا کئے گئے تھے۔ پچھلے دو سالوں سے یونین کے کام میں دلچسپی لینے والے مزدوروں کے ساتھ یہ رویہ اختیار کیا جاتا رہا ہے کہ انھیں بغیر کوئی چارج شیٹ دیئے مل میں داخل ہونے سے روک دیا جاتا ہے۔ جب وہ محکمہ محنت میں اس سلسلے میں درخواست پیش کرتے ہیں تو انتظامیہ کی طرف سے جواب دیا جاتا ہے کہ مزدور نے خود ہی کام پر آنا چھوڑ دیا — اور پھر کسی نہ کسی طرح ان مزدوروں کی ملازمت بحال نہیں کی جاتی — ان دو سالوں میں اشیاء صرف کی قیمتوں میں سات سے بیس فیصد تک اضافہ ہوا ہے۔ ادھر نہ صرف یہ کہ مزدوروں کی اجرتیں وہی رہیں بلکہ ان میں کافی کمی واقع ہوئی ہے۔ ان حالات سے مجبور ہو کر مزدور اجتماعی جد و جہد کرنا شروع کرتے ہیں اور مل مالکوں کے لئے یہ خطرے کی گھنٹی ہے — مزدوروں کے متحد ہونے اور کوئی اجتماعی قدم اٹھانے سے بیشتر مل مالکان ایسے اقدامات کرتے ہیں کہ —

مزدور مشتعل ہو کر ہڑتال کر دیں۔ چونکہ حکومت بلا امتیاز ہڑتال کی مخالف ہے اور اپنی پوری مشینری اس کے خلاف استعمال کرتی ہے اس لئے مل مالکوں کے لئے یہ بات آسان ہو جاتی ہے کہ ہڑتال کے بعد تمام سرگرم مزدوروں کو ملازمتوں سے علیحدہ کر دیں۔ پچھلے چند دنوں سے اس پالیسی کا عملی اظہار ہو رہا ہے جن ملوں سے مزدوروں کی برطرفی عمل میں آتی ہے ان میں۔ احمد عبدالغنی ٹیکسٹائل ملز۔ لاکھانی سلک اینڈ کاٹن ملز۔ غفور ٹیکسٹائل ملز۔ اور حبیب ٹیکسٹائل ملز شامل ہیں ان میں سے ہر مل سے پچیس اور پچاس کے درمیان مزدوروں کو برخواست کر دیا گیا ہے۔ لاکھانی کی انتظامیہ اس سلسلے میں سب سے آگے ہے۔ پہلے تو انھوں نے تیس کے قریب مزدوروں کو گیٹ بند کیا۔ اس کے بعد پانچ نمائندوں کی طرف سے ہڑتال کا نوٹس دیا گیا۔ تو مروجہ قانون کی واضح اور دانستہ طور پر خلاف ورزی کرتے ہوئے ان پانچ نمائندوں کے کارڈ بھی روک لئے گئے اور انھیں طرح طرح کے لالچ اور دھمکیاں دی گئیں کہ ہڑتال نوٹس واپس لے لیں۔ انکی غیر قانونی تالہ بندی کی تحریری اطلاع مصالحتی افسر کو دیدی گئی ہے — اس کے باوجود کوئی کاروائی عمل میں نہیں لائی گئی۔ یہ افواہ بھی گشت کر رہی ہے کہ لاکھانی ملز کے منتظمین نے پانچ میں سے دو نمائندوں کو غائب کر دیا ہے۔ بہر حال یہ امر تصدیق طلب ہے۔

حبیب ٹیکسٹائل ملز کے مزدوروں نے یونین کا ہنگامی اجلاس طلب کرنے کا نوٹس دے دیا

کراچی (نمائندہ منشور) حبیب ٹیکسٹائل ملز ان پانچ ٹیکسٹائل ملوں میں سے ایک ہے جسمیں ۳ ۶۲ء میں ایک ماہ سے زائد عرصے تک مکمل ہڑتال رہی۔ اور عام ہڑتال کے بعد منتظمین نے مزدوروں سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ لیکن بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ منتظمین نے یہ معاہدہ خلوص کے ساتھ نہیں کیا تھا۔ کیونکہ معاہدہ

کے چندہی دنوں بعد انھوں نے انتقامی کاروائیاں شروع کردیں یونین کے صدر چاچا علی جان کی گرفتاری سے فائدہ اٹھاکر یونین کے سیکڑوں سرگرم کارکنوں کو ملازمت سے علیٰحدہ کردیا۔ اور جب حبیب ٹیکسٹائل مل لیبر یونین کا رجسٹریشن منسوخ کردیا گیا تو منتظمین نے اپنے چند زرخرید چمچوں کے ذریعہ ایک یونین حبیب ٹیکسٹائل مز لیبر یونین کے نام سے رجسٹر کروالی۔ رجسٹریشن سے لے کر اس وقت تک یونین کی جنرل باڈی کا کوئی جلسہ طلب نہیں کیا گیا۔ نہ ہی عہدیدار مزدوروں نے چنے ہیں۔ مزدور اب روزافزوں بگڑتے ہوئے حالات کا ر اور پاکٹ یونین کی بے عملی سے تنگ آگئے ہیں۔

اس لئے انھوں نے یونین کے صدر شمس الدین اور جنرل سیکریڑی محمد سلیم کو ایک ہزار، ۵ دستخطوں سے یونین کا ہنگامی جلسہ عام طلب کرنے کا نوٹس دے دیا ہے یہ نوٹس یونین کے دستور کے مطابق دیا گیا ہے اور اسکی ایک نقل رجسٹرار ٹریڈ یونین کو بھیج دی گئی ہے یہ نوٹس یونین کے عہدیداروں کو بذریعہ رجسٹری بھیج دیا گیا ہے۔ کیونکہ انھوں نے دستی قبول کرنے سے انکار کردیا ہے۔ بہرحال ۱۰ مارچ ۶۵ء کو یونین نے یہ نوٹس وصول کرلیا ہے دستور کی رو سے اب وہ تین ہفتہ کے اندر اندر مٹنگ بلانے پر مجبور ہیں اگر انھوں نے مٹنگ نہ بلائی تو دستخط کرنے والے ممبروں کو یہ اختیار ہو گا کہ وہ خود ہنگامی اجلاس منعقد کرلیں اور اس کے تمام فیصلے قانونی ہونگے اور ممبروں پر انکی پابندی لازمی ہوگی۔

یعقوب بسکٹ فیکٹری ایمپلائیز یونین کا اجلاس

سکھر ۱۳ مارچ۔ آج یہاں فیکٹری گیٹ کے بالمقابل یعقوب بسکٹ فیکٹری ایمپلائز یونین کا اجلاس ہوا جسکی صدارت یونین کے نائب صدر نے کی۔ نائب سیکریٹری نے تقریر کرتے ہوئے مزدوروں کی پریشانیوں اور مالک کی ہٹ دھرمی اور ورک منیجر کی مزدروں کے ساتھ غنڈہ گردی کی پرزور مذمت کی اور مندرجہ ذیل قراردادیں منظور کی گئیں۔

۱:۔ یہ اجلاس پرزور مطالبہ کرتا ہے کہ سیٹھ محمد ایوب بلاوجہ مزدوروں کی برطرفی کا سلسلہ ختم کریں۔ ۲:۔ نئے آدمیوں کی بھرتی مستقل کرنے کی شرط پر کی جائے اور پرانے ملازم کی طرح اجرت دی جائے۔ ۳:۔ لیبر ڈپارٹمنٹ کی مسلسل خاموشی پر یہ اجلاس اپنے غم و غصہ کا اظہار کرتا ہے۔ ۴:۔ سیٹھ نے جو حضرت گل نامی غنڈے کو پناہ دے رکھی ہے اس کو فیکٹری سے فوراً نکال دیا جائے ورنہ کسی قسم کے جھگڑے فساد کی ذمہ داری خود ان پر ہوگی۔ ۵:۔ ورک منیجر اور،

جنرل منیجر نے جو ملازموں کو انکی منظور شدہ چھٹی پر برطرف کرنے کا طریقہ رائج کر رکھا ہے ختم کیا جائے ورنہ وہ نتائج کے ذمہ دار ہونگے۔

بعدازاں ظفر قریشی کی موت پر رنج و غم کا اظہار

جے کے، این کورنگی کے مزدوروں کا احتجاج

لانڈھی (نمائندہ منشور) جی۔ کے۔ این کورنگی کے مزدوروں نے اپنے ایک ساتھی کے خلاف منتظمین کے غلط اقدام کے خلاف اور مطالبات کے سلسلہ میں جو رویہ اختیار کیا ہے اس پر ناراضگی کے طور پر اپنے بازؤں پر سیاہ بلے باندھ کر احتجاج کیا ہے یاد رہے ایک مزدور کو غلط الزام لگاکر منتظمین نے معطل کردیا تھا جسے بعد میں کام پر واپس لے لیا گیا۔ نیز مصالحتی کوششوں میں ناکامی کے باعث مزدوروں نے فیصلہ کیا ہے کہ مطالبات کا معاملہ انڈسٹریل کورٹ کے سپرد کردیا جائے۔

مسلم کمرشل بنک اسٹاف یونین کا ھنگامی جلسۂ عام

کراچی (نمائندہ منشور) یہاں مسلم کمرشل بنک کا ایک جلسہ عام منعقد ہوا جس میں مندرجہ ذیل قراردادیں منظور کی گئیں۔

بنک کے مزدور جن مشکلات سے دوچار ہیں ان کو دور کرنے کے لئے طریقہ کار پر غور کیا گیا۔ اور مہنگائی کا مقابلہ کرنے لئے مناسب قدم اٹھانے پر غور کیا گیا۔ منتظمین کی طرف سے غیر قانونی سرگرمیوں اور اللہ دتہ ڈرائیور کی برطرفی اور محمد قاسم عبداللہ کو پریشان کئے جانے کی یہ اجلاس پرزور مذمت کرتا ہے۔ منتظمین نے خلاف اس شکایت پر کہ وہ نمائندوں سے گفتگو کے موقع پر سخت بداخلاقی سے پیش آئے اور کئی ممبروں سے استعفٰی دینے کو کہا۔ اجلاس نے اس سلسلے میں مناسب اقدام پر غور کیا۔ جلسہ عام میں فیصلہ ہوا کہ ان سب مسائل کے حل کے لئے ۳۰ مارچ ۶۵ء کو ہڑتال کا بیلٹ لیا جائے اور اس دوران انتظامیہ پر زور دیا جائے کہ صنعتی امن قائم رکھنے کے لئے ان مسائل کو مذاکرات کے ذریعہ حل کرلیا جائے۔ اس جلسہ عام سے فیڈریشن آف بنک یونینز کے سیکریڑی جنرل جناب اخلاق حسین، نیشنل بنک آف پاکستان اسٹاف یونین کے صدر جناب اخلاق حسین اور اسٹیٹ بنک آف انڈیا اسٹاف یونین اور فیڈریشن آف بنک ایمپلائز یونین کے نائب صدر جناب اکرام حسین اعظمی اور اسٹیٹ بنک آف پاکستان درجہ سوئم ملازمین یونین کے جناب شیخ صاحب کے جلسے سے خطاب کیا۔ اور اپنے ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا۔

لوگ کہتے ہیں



کراچی

بھیا!

نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی سر آنکھوں پر مگر اس طرح اور ایسے فنکاروں سے تعاون کیجئے جن میں واقعی کچھ جان ہو۔ "منشور" بابت فروری ۶۵ء میں ایک غزل جناب رحمت اللہ صدیقی صاحب کی آپ نے شائع کی ہے جس کا ایک مصرعہ بحر سے خارج ہے۔

ملاحظہ فرمائیے ع

اشک آلودہ نہ قسمت پہ کوئی ہو گی شمع

اساتذہ نے ابھی تک شمع کو بروزن "طرح" اور "صبح" استعمال کیا ہے۔ لیکن صاحب غزل نے اپنی غزل میں شمع کو "سحر اور جگر" وغیرہ کا ہم وزن قرار دیا ہے۔ اسی غزل کا ایک اور مصرعہ ملاحظہ کیجئے۔

مسکرا اٹھیں گے پھر پچھلے پہر بلبل و گل۔

اس مصرعہ کی نشست و برخاست غلط ہے، قاری کی زبان میں لکنت پیدا کر دیتا ہے۔ اس قسم کی فنی خامیاں منشور کو بے حد متاثر کر رہی ہیں۔ امید ہے آئندہ آپ احتیاط برتیں گے۔ حبیب جالب کی غزل پسند آئی۔ ماحول کی بہترین عکاسی ہے۔

فیروز نظر

سیہور (بھوپال)

میرے بھائی اداب،

تقریباً تین ماہ بعد منشور سے فروری کے شمارے کی وساطت سے ملاقات ہوئی۔ موجودہ شمارہ بھی خوب تر ہے۔ اب منشور تعریف لکھنے اور تعریف چھاپنے کے دور سے گزر چکا ہے۔ میرا خیال ہے "لوگ کہتے ہیں" کے

تحت مضامین پر مناسب تبصرے اور تنقید شائع کیجئے تو ادبی مضامین کی جو کمی منشور میں کھٹکتی ہے وہ کسی حد تک کم ہو جائے گی۔ سائز آپ نے تبدیل کر لیا یہ بہت اچھا ہوا۔ موجودہ سائز بہت اچھا ہے انفرادیت اور حسن کے لحاظ سے بھی اور اس طرح بھی کہ اسے پڑھنے کے لئے عقاب کی طرح بازو نہیں پھیلانا پڑتے۔

مظفر حنفی

لاڑکانہ

مکرمی۔ تسلیم

بڑے انتظار کے بعد فروری کا منشور موصول ہوا سالنامہ کی مقبولیت ہر حلقہ میں پائی گئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ "منشور" کا سالنامہ کئی اعتبار سے بہت کامیاب ہے فروری کا شمارہ اپنے روایتی حسن کا علمبردار ہے۔ یہاں کچھ لوگ منشور کے تین کالمی سلسلے کو دو کالمی کر دینے پر زور دیتے ہیں۔ ممکن ہے کراچی کے احباب کی اکثریت تین کالم کے حق میں ہو۔ فروری کے شمارے میں چاچا علی جان کا انٹرویو پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ یہ بڑا اچھا سلسلہ ہے۔

مسلم شمیم

کراچی

مکرمی اسلام علیکم

آپ کا ماہنامہ منشور دل پسند ہے۔ مضامین و غزلیات کی ترتیب سے ثابت ہوتا ہے کہ مدیر اور معاونین حضرات کافی تجربہ کار اور محنتی ہیں۔ اور ان کا کارنامہ وقت کے لحاظ سے قابل تعریف ہے۔ لیکن قارئین کرام سے رابطہ قائم رکھنے کے لئے آپ نے کیا اقدام کیا ہے واللہ اعلم۔

ندرت بھرتپوری

دیناج پور (مشرقی پاکستان)

پیارے بھائی سبط! آداب و نیاز۔

منشور مجھے چاٹگام ہی میں ملا تھا۔ پرچہ پڑھا دیکھا۔ یقین مانئے ہم نے ایسا خوبصورت اور سجا ہوا سالنامہ کسی اور پرچہ کا دیکھا ہو۔ حالانکہ منشور سے بھی اچھے اور نامور پرچے موجود ہیں۔ لیکن اسکی روش نے کم از کم ادبی دنیا میں ہلچل سی پیدا کر دی ہے۔

آپ نے جس خلوص و محبت سے اداریہ لکھا ہے میں اس سے بالکل قائل ہوں۔ میرا ہی خیال کیا ساری دنیا کے ادب نوازوں کا یہ خیال ہوتا ہے کہ ادب کی زیبائش کے واسطے خوب آراستگی پیدا کیجائے۔ میں سمجھتی ہوں کچھ دنوں میں یہ پرچہ چیلنج کی حیثیت اختیار کر جائے گا لیکن ایک التجا ہے۔ آپ اپنے پرچے کو شخصیت پرستی اور حلقہ بندی پر نہ ڈال دیجئے گا کیونکہ آج کے فرعون ادب اپنا ہی سکہ ہر طرف جما دیکھنا چاہتے ہیں غیروں کو تو ایسی سزا ملتی ہے کہ توبہ ہی بھلی۔

روشن آرا نیر

گورکھپور

محبی جناب سبط اختر صاحب اجاب عالی۔

"منشور" کا سالنامہ موصول ہوا۔ پچھلی بار غالباً ڈاک کی گڑبڑ کی وجہ سے مجھے یہ سالنامہ نہیں ملا تھا آپ نے منشور واقعی بہت شاندار شائع کیا ہے ہندوستان اور پاکستان کے سبھی نامور شاعر اور ادیب یکجا ہو گئے ہیں۔ یہ سالنامہ ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کامیابی پر میں دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

سلام سندیلوی

بمبئی

اختر بھائی!

جنوری کا خاص نمبر (سالنامہ) میں نے پرسوں دیکھا ہے۔ یقین مانئے بے حد دکھ ہوا کہ میں اس میں شریک نہ ہو سکا آپ کا یہ خاص نمبر مجھے بے حد پسند آیا۔ اتنے پیارے سالنامے پر میری طرف سے دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔

ہربنس دوست

کراچی

محترمی اسلام علیکم

منشور کا باضابطہ مطالعہ کرتا ہوں کافی عرصہ سے پیغام مبارکباد دینے کے لئے سوچ رہا تھا۔ مگر افسوس مصروفیت کے باعث نہ لکھ سکا تھا۔ مگر اب جبکہ ٹائیٹل پر حبیب جالب (فروری ۶۵ء) کو پڑھا تو بے اختیار مبارکباد دینے کو دل چاہا۔ امید ہے خاکسار کی مبارکباد قبول فرمائی جائے گی۔ اتنا اچھا رسالہ آج تک میری نظروں سے نہیں گزرا منشور

کے تیور بتاتے ہیں کہ اب صبح قریب ہے۔ یوں تو منشور کی تمام تخلیقات اچھی ہوتی ہیں مگر "اداریہ" اور "بار کو پو لو" منشور کی جان ہیں۔ میری دعا ہے کہ خداوند کریم منشور کو سامراج کی نظر بد سے بچائے اور منشور پھولے پھلے۔

شوکت علی رائے پوری

لکھنؤ

محترمی ایڈیٹر صاحب! تسلیم

منشور کا سالنامہ اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ نظر نواز ہوا۔ بہت سی اور خوبیوں کے ساتھ سب سے بڑی خصوصیت جو مجھے نظر آئی کہ آپ کا رسالہ مدیرانہ خلوص کی نئی قدروں کا ترجمان ہے اس خلوص نے مجھے بہت متاثر کیا۔ سالنامہ کو ادبی شاہکار بنانے کے لئے آپ کتنے شب و روز سرگرم عمل رہے ہوں گے۔ جس محنت سے اسے آپ نے ترتیب دیا ہے۔ واقعی داد کی مستحق ہے۔

صغیرہ نسیم

ڈیرہ اسمٰعیل خان

مکرم و معظم جناب والاشان ایڈیٹر صاحب

سلامت باشد۔ بعد از نیاز و سلام عرض خدمت ہے کہ بندہ ناچیز بمعہ اراکین یونین آپ کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ آپ اپنے عزیز بھائیوں کو اپنے "منشور" کی اشاعت کرکے سرفراز فرماتے ہیں اور ہر طرح دلجوئی اور رہنمائی کرتے ہیں۔ خداوند کریم آپکو ہمیشہ قوم و ملت کی ہمدردی کی توفیق عطا فرمائے۔

والسلام

ملک خدا بخش

کراچی

مکرمی ایڈیٹر صاحب! السلام علیکم

منشور کا باقاعدہ مطالعہ باعث تمانیت ہے بار بار سوچا مبارکباد دوں مگر فرصت کے لمحات غائب تھے۔ سالنامہ قابل رشک تھا۔ امید ہے یوم مئی نمبر بھی قابل رشک ہوگا۔ آپکی مساعی پر مبارکباد نہ دینا ایک قسم کی ادبی زیادتی ہے۔ فروری ۶۵ء کے شمارہ میں اداریہ ادھورا رہ گیا جسکا مجھے بے حد قلق ہے امید ہے آئندہ احتیاط برتیں گے۔

ڈاکٹر شمع قدر صدیقی

لاہور

مکرمی ایڈیٹر صاحب تسلیم

میں پچھلے کافی عرصہ سے "منشور" کا باقاعدہ مطالعہ کر رہا ہوں۔ لیکن سالنامہ دیکھ کر مجھے بہت خوشی حاصل ہوئی اور میں نے بڑی دلچسپی کے ساتھ اسے پڑھا ہے۔ نظمیں اور غزلیں بہت اچھی ہیں اور افسانے بھی بہت لاجواب ہیں۔ خاص کر سرورق پر فیض احمد فیض کا آغاز سخن بہت پسند آیا۔ ہند و پاک کے نامور ادبا و شعراء کا قلمی تعاون آپ ہی کے پرچے کو حاصل ہے۔ منشور بڑی تیز رفتاری کے ساتھ ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ آپ نے نئے لکھنے والوں کو موقع دے کر انکی ہمت افزائی کی ہے۔

حنیف مرزا جذبی

بقیہ:۔ اداریہ

پاک چین دوستی

اب یہ ہمارا فرض ہے کہ اس دور کے سب سے بڑے سامراجی اژدہے ۔ امریکہ اور اس کے سنپولئے ۔ برطانیہ سے، جو ہمیں ڈس چکے ہیں، اپنا پیچھا چھڑائیں۔

چین کے عوام اور رہنماؤں نے پاکستان کا اس آڑے وقت میں ساتھ دے کر پاکستانی عوام کا دل جیت لیا ہے۔ لہٰذا جب وہ ہمارے ساتھ ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم ان کے ساتھ نہ ہوں ۔ یہ بات ابھی سوچ لینے کی ہے کہ اگر ہم نے ۔ چین کی اس دوستی کو برطانوی وزیر اعظم ولسن، امریکی صدر جانسن اور دوسرے مغربی شاطروں کے اشارے پر مغرب سے کسی بھی قسم کی بھونڈی اور چھچھوری "سودے بازی" کرنے کے لئے بھینٹ چڑھا دیا تو یہ ہمارے لئے اپنے آپ کو ہلاکت کے بھنور میں ڈالنے سے کسی طرح بھی کم نہ ہوگا۔

آج ۔ اس دور میں ۔ "نام نہاد غیر جانبداری" ۔ اختیار کرنا بھی بھارت کے نقش قدم پر چل کر نہ صرف خود اپنے آپ کو، بلکہ قومی اور آزادی کی دوسری تحریکوں کو بھی کمزور بنانے کے مترادف ہے۔ بالکل سامراج کی گود میں بیٹھ جانا ہے ۔ دوغلا پن ہے ۔ دھوکے کی ٹٹی ہے ۔ پچھلے عالمی حالات اور اپنے ملکی حالات ہمارے سامنے ہیں اور اب ہمیں مستقل مزاجی اور نیک نیتی کے ساتھ یہ طے کرنا ہے کہ ہمارا راستہ کون سا ہوگا ۔ راستے صرف دو ہیں۔

* عوام دوستی یا عوام دشمنی ۔؟
* باعزت اور باوقار خود مختاری یا ذلت و خواری؟
* سامراج دوستی یا سامراج دشمنی ۔؟

بقیہ

الف پر تبصرہ

آفرینش علم شعور حیات ۔!
کچھ نہیں اک جمال ذات پہ ہیں
صد حجابات رنگ رنگ صفات
اور یہ بھی تمام وہم و گماں
اور یہ بھی تمام مفروضات ۔ "

(رئیس امروہوی)

جہاں تک رئیس کی نظم کا تعلق ہے اس میں کسی ذہنی الجھن کو دخل نہیں جو بات شاعر کے دل و دماغ میں ہے وہ زبان پر انتہائی موزوں الفاظ کا جامہ پہنے آگئی ہے اور پھر قاری کے ذہن میں بھی اتر گئی ہے ۔ رئیس نے غزل پسند طبیعت پانے کے سبب اپنی نظم میں بھی تغزل کا سا ماحول پیدا کر دیا ہے اور بعض نظموں پر تو غزل ہی کا گمان ہوتا ہے ۔ اگر واقعاتی کڑیاں درمیان سے کاٹ دی جائیں تو نظم کا ماحول ختم ہو جاتا ہے اور نظم ہلکی پھلکی جوان و سادہ غزل کا روپ دھار لیتی ہے۔

"یاد یار دلستاں" تو مسلسل غزل کی خوشگوار مثال ہے۔

"ہم" میں بھی ایک پختہ کار غزل گو غزل سرائی کر رہا ہے۔

چھین لیں خود جو ہر اشیاء جو ہوں بر ہم ہے ہم
پھول سے خوشبو، چمن سے رنگ دلو شبنم سے نم
دست انساں میں ہے حسن دو جہاں کا آئینہ
شاہد فطرت نکال اب گیسوئے پر خم کے خم

اسی طرح "زخم کا" میں بھی ایک فراقیہ غزل کی نوائے پرسوز دبی ہوتی ہے۔

"الف" میں شاعرانہ چاشنی، ادبی عظمت، رنگینی بیانی، نازک خیالی، اور پختہ کاری کے علاوہ الفاظ کا ایک بحر ذخار موجیں مار رہا ہے

تراکیب میں بھی ندرت و قدرت ہے۔

ان جملہ محاسن شعری اور علو معانی کے ساتھ ساتھ شاعر کا اعتراف عجز و انکساری کے طور پر اپنے گرانقدر مجموعے کو "الف" کے نام سے موسوم کرنا تعجب خیز بھی ہے۔ معنی خیز بھی اور عبرت آموز بھی ۔ تبحر علمی کے ساتھ ساتھ رئیس عالی ظرف بھی ہے اور یہ عالی ظرفی کی بہت بڑی نشانی ہے کہ اتنا بڑا شاعر ابھی تک آپ کو دیوار دبستان پر لام الف لکھتے ظاہر کرتا ہے۔ "الف" کا مصنف نہ صرف اعلیٰ شاعر ہے بلکہ عالی فطرت انسان بھی ہے اور "الف" اس کی صفات جمیلہ کا ایک ناطق آئینہ ہے۔

حرف سے معانی تک



الف

رئیس امروہوی

تبصرہ

رضا ہمدانی

جنگ کا مہیب دیوتا اپنی تمام ترنحوستیں لئے جب فضا میں دہشت و بربیت کی آگ پھیلا دیتا ہے تو انسان وانسانیت کے لئے زندگی اجیرن ہو جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ اس نحوست سے ہر فرد و بشر پناہ مانگتا ہے شاعر، کہ عام انسان سے زیادہ حساس ہے وہ جنگ کے خلاف سر ہتھیلی پر رکھ کر قلمی جہاد میں مصروف ہو جاتا ہے - رئیس امروہوی کہ بہت بڑا احساس شاعر ہے — جب یہ اپنے افکار کا مجموعہ مرتب کرتا ہے تو اس کا انتساب ان الفاظ کے ساتھ شروع کرتا ہے -

"میں پہلی جنگ عظیم میں پیدا ہوا —
دوسری جنگ عظیم میں میری شاعری پروان
چڑھی — اور تیسری جنگ عظیم —؟"

———— ان الفاظ سے شاعر کے ذہنی پس منظر کا عکس ہویدا ہے -، شاعر کو اک گونہ افسوس ہے کہ وہ ایسی منحوس گھڑی میں کیوں پیدا ہوا اور پھر اسے اس کا بھی صدمہ ہے کہ اسکی شاعری ایسے پر آشوب اور انسان کش عہد میں کیوں شباب پر تھی - جبکہ انسانی عظمت خونی جبڑوں میں کراہ رہی تھی - اور پھر شاعر تیسری جنگ عظیم کے خدشے سے ہر بلب ہے -

———— "الف" کی پہلی غزل ایک تعارف ہے - رئیس امروہوی کے اندر چھپے ہوئے شاعر کا ؎

دیارِ شاہدِ بلقیس ادا سے آیا ہوں

شاعر کی انفرادیت میں ایک خصوصیت ہے اور وہ زمان و مکان اور اشیاءِ ہستی سے اپنے آپ کو ارفع و اعلیٰ خیال کرتا ہے - اس کے ضمیر کی خودی علی الاعلان پکار رہی ؎

دمک رہی ہے زمان و مکاں کی پیشانی
ستارۂ ابدی ہوں خلاء سے آیا ہوں

تمہارے غنچہ و گل سے غرض نہیں ہم کو
ادھر اشارہ بادِ صبا سے آیا ہوں

"الف" کا پہلا حصہ غزلیات پر مشتمل ہے - جو ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۳ء تک کے عرصہ کو احاطہ کرتا ہے

رئیس امروہوی ————

کی غزل نئے تقاضوں سے بھرپور ہے - رئیس کی غزل بیمار نہیں - بلکہ تندرست، صحت مند، قد آور، و پائندار ہے اس میں ایک جذبہ ہے آگے بڑھنے کا - ایک عزم ہے مچلنے کا - اور ایک آہنگ ہے حیات نو سے بغلگیر ہونے کا — رئیس کی غزل کا محل انہیں بنیادوں پر استوار ہے - اور یہ بنیادیں ظاہر ہے سیسہ پلائی ہوئی دیوار سے کسی ———— طرح کم نہیں ہے - عزم و ارادے کی پختگی رئیس کو غزل ایسے نازک قالب میں بھی نچلا بیٹھنے نہیں دیتی

رئیس کی غزل میں رکاکت و سبکی کا وجود نہیں - اور غزل کا حسن   اور جمالیاتی رکھ رکھاؤ قدم قدم پر جلوہ گری کر رہے ہیں -

تاہم جمالیاتی رو کی شدت رئیس کو اپنے ساتھ بہا کر نہیں لے جاتی - بلکہ وہ غم یار کے ساتھ اپنے آپ کو بھی نہیں بھولتے - مثلاً ان کا یہ شعر ؎

دل غم دو جہاں میں ڈوب گیا
بے کراں بے کراں میں ڈوب گیا

اس دعوے کے ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہے —

شاعر کے نزدیک فلسفۂ حسن و عشق میں عشق کو بہرحال برتری حاصل ہے - عشق کو حسن کے جلوؤں میں مدغم ہونے کی اجازت نہیں دی جا سکتی مثلاً یہ شعر ؎

جانِ جاناں، ترا سفینۂ حسن
مرے دریائے جاں میں ڈوب گیا

رئیس کے ہاں عروس شعر کے لئے سولہ سنگار اشد ضروری ہیں رئیس کے شعر کا حسن و جمال مقصدی کاٹ لئے ہوئے ہے -

خود اپنے ہی قلب خونچکاں میں
خنجر کی طرح اتر رہا ہوں -!
فریاد کہ زیر سایۂ گل!
میں زہر خزاں سے مر رہا ہوں

احساسِ شاعر کے پیمانے بھی جمالیاتی آب و رنگ سے خالی نہیں

درد جو عقل کے اسراف سے بچ رہتا ہے
عشق کے قحط زدوں کا ہے وہی سرمایہ

ان کے نزدیک عقل درد کے مقام سے بے خبر ہے۔ وہ لذت درد کا احساس ہی نہیں رکھتا، عقل کو ان کے نزدیک وقوف درد سے بے بہرہ دیکھ کر شاعر اپنے ہونٹ کاٹنے لگتا ہے

دیدہ و دل سے گذرتا ہے کوئی شخص اکثر
جیسے آہوئے گریزاں کا گریزاں سایہ

"آہوئے رمیدہ" کے "گریزاں سایہ" نے تشبیہ نام کے ساتھ ساتھ خیالات کی اپج کا اظہار بھی کر دیا ہے غزل کے سانچے میں جن نئے افکار کو رئیس نے ڈھالا ہے۔ وہ تغزل میں اضافے کا باعث ہے مثلاً یہ شعر

فروغ حسن سے ہو کر گذر رہا ہوں میں
ہر ایک لمحۂ دید ایک سالِ نوری ہے

سال نوری کی ترکیب و تشبیہ، ایک حسین تلاش ہے۔

نشاط وصل میں رئیس کے محسوسات نے درد فراق کی ٹیسوں سے زیادہ لذت پائی۔ مگر وصل کا نشاط یہاں بھی باعثِ مسرت نہیں

غم فراق میں اب تک نصیب نہ ہو سکا
نشاط وصل میں جو کرب ناصبوری ہے

"کرب ناصبوری" شاعر کی وقت پسند طبیعت کا آئینہ دار ہے اسی طرح حسن کو آسودہ سمجھنے والوں کے لئے ذیل کا شعر قابل غور ہے

کس نے دیکھے ہیں تری روح کے رستے ہوئے زخم
کون اترا ہے ترے حسن کی گہرائی میں

"الف" کا شاعر بنیادی طور رجائی ہے اور مذہب شاعری میں غیر مقلد ہے۔ کم از کم ذیل نے نادر شعر سے تو یہی مترشح ہوتا ہے

تقلید خضر سے نہ کوئی رستا ملا!
میں خود ہی بڑھ کے قافلے والوں سے جا ملا

عشق تہِ سنگ رہ کر بھی گل کھلا رہا ہے

شگاف سنگ سے ابھرا ہے لالۂ کہسار
یہ کوہکن کا کوئی زخم خونچکاں تو نہیں

غرض رئیس امروہوی کی غزل رئیسانہ ہے

ذیل کے اشعار ہمارے اس دعوے کے شاہد عادل ہیں

کتنے غنچے ہیں کہ بن جاتے ہیں تقلید بہار
کتنے گل ہیں کہ گلستاں نہیں ہوتے پاتے

شارحین چمن اے کاش اسے پڑھ سکتے
جو حکایت ورقِ گل پہ لکھی ہوتی ہے

عشق کو باز نہ رکھ نغمہ سرا ہونے سے
نغمہ مر جاتا ہے محروم صدا ہونے سے

محفلیں ماہ و ستارہ کی سجانے والے
ہائے کیا چیز ترا عالم تنہائی ہے

جبین غنچہ و گل سے ٹپک رہا ہے لہو
کسے خبر کہ مآلِ شگفتگی کیا ہے

اب دل کی یہ شکل ہو گئی ہے
جیسے کوئی چیز کھو گئی ہے

اس بحر میں کتنی کشتیوں کو
ساحل کی ہوا ڈبو گئی ہے
گل جن کی ہنسی اڑا گئے تھے
شبنم بھی انھیں کو رو گئی ہے

تمہیں دل سے بھلا دینے کے باوصف
تمہاری یاد ہو کر رہ گیا ہوں
مری تخلیق نغمے سے ہوئی تھی —!
مگر فریاد ہو کر رہ گیا ہوں
مجھے ختم اسیری سے ملا کیا
فقط آزاد ہو کر رہ گیا ہوں

عظمتیں اصنام کی اب کچھ سمجھ میں آگئیں
تیشۂ فرہاد کی ضربیں تھیں جو پتھرا گئیں

کام اس طرح تو اتر نہ ہمارے ہوتے
تم نے گیسو اگر اپنے ہی سنوارے ہوتے
رہ گئے اشک میری آنکھ میں آنسو بن کر
ان کے دامن پہ چمکتے تو ستارے ہوتے
کاش دنیا کے مصائب کو سمجھنے کے لئے
تم نے کچھ دن میری دنیا میں گذارے ہوتے

رئیس انکی جوانی بھی کیا جوانی تھی
رئیس اپنا زمانہ بھی کیا زمانہ تھا

بحیثیت مجموعی رئیس کی غزل میں نوائے درد کے ساتھ ساتھ علاج درد بھی ہے

کو معیاری بنا دیا ہے۔ اب یہ غم جاناں غم دوراں دونوں آنکھیں دکھا سکتی ہے۔ مداوا بھی کر سکتی ہے۔ اس میں ایک دراک ذہن و دماغ اور ایک دردمند وحساس دل بھی ہے۔ دل اور دماغ دونوں یک جان ہو کر ایک معتدل نظام زندگی ترتیب دے رہے ہیں — اور یہ جذبہ وارادہ منظومات کے حصّہ کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے

غزل میں دل کی باتیں زیادہ ہیں جبکہ نظم میں ذہن کا تعاون بھی ہے۔

رئیس کی منظومات میں روائتی انداز نہیں بلکہ اس میں عصر حاضر کے مسائل کی آنچ ہے۔ نئی اسلوب کا طوفان ہے۔ اور شاید عصر حاضر کو رومانی موباف سے سنوارا گیا ہے حقیقت پسندی کے پیمانے سے مزاج دہر کا اندازہ لگا کر نظم کو محض خیالی بھول بھلیوں میں نہیں الجھایا گیا۔ رئیس کی نظم حیات انسانی کے مختلف پہلوؤں پر ایک بے باک تنقید ہے۔

تضاد بشر، خواب پریشاں، ارض افسون و افسانہ اور خلوت نامہ میں یہ حقیقتیں ہیں جنھیں اٹل کہا جاتا ہے — خلوت کی دست درازیوں کے ذکر میں شاعر کا تخیل انتہائی عروج پر ہے مقصدی مواد سے قطع نظر اس نظم میں جمالیاتی اپیل کی جلوہ گری ہے جیسے یہ شعر

ان کے ماتھے پہ جو افشاں کی دھنک سی ٹوٹی
کتنے تاروں کا چراغاں سرِ محفل پایا

نظم کے ایسے اشعار میں تغزل کا سماں ہے اور جذبات کی ہولی کھیلی گئی ہے جس سے ایک دلپسند سماں پیدا ہو گیا ہے۔

دورِ آیا میں شاعر نے عہد جواں کے دل ٹٹول کر اس کا تجزیہ کیا ہے۔

عہد نو میں شاعر کا جیتا جاگتا احساس عہد نو کا صحیح ترجمان بھی ہے اور عہد حاضر کا دلچسپ تجزیہ بھی۔ نظم کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے

ہم دمو، ہم نواؤ، ہم کارو
اے نئے عہد کے قلم کارو
ناز پروردگانِ لوح و قلم
تم سے تخلیق و ارتقا کا بھرم

اس آغاز کے علاوہ نظم کا سارا کینوس شعلہ و شبنم کے نقش و نگار سے مزین ہے

"مرزا غالب" میں شاعر نے غالب کے ساتھ جنت میں ملاقات کی ہے۔ یہ نظم غالب کا ایک نفسیاتی تجزیہ ہے جس کے پس منظر میں غالب کے قصیدۂ مدحیہ کے دھندلے دھندلے نقوش چھائے ہوئے ہیں

غالب کے اس قصیدہ کی تشبیب تشکیکانہ ہے اور تشکک غالب کا مرغوب موضوع رہا ہے۔ وہ تشکک ہی میں زندگی پاتا ہے — یہ نظریہ بقول رئیس بعد مرگ بھی غالب نے ترک نہیں کیا۔ چنانچہ مرزا مرحوم جب ہمارے شاعر رئیس سے رخصت ہوتے ہیں تو ان کے کان میں یہ بات ڈالی جاتی ہے

"نہ ظہورِ بدایت و آغاز!
نہ حد و نہایت و غایات
حرکت، مادہ، توانائی

باقی صفحہ ۳۹ پر



ہدایت کار عابدی

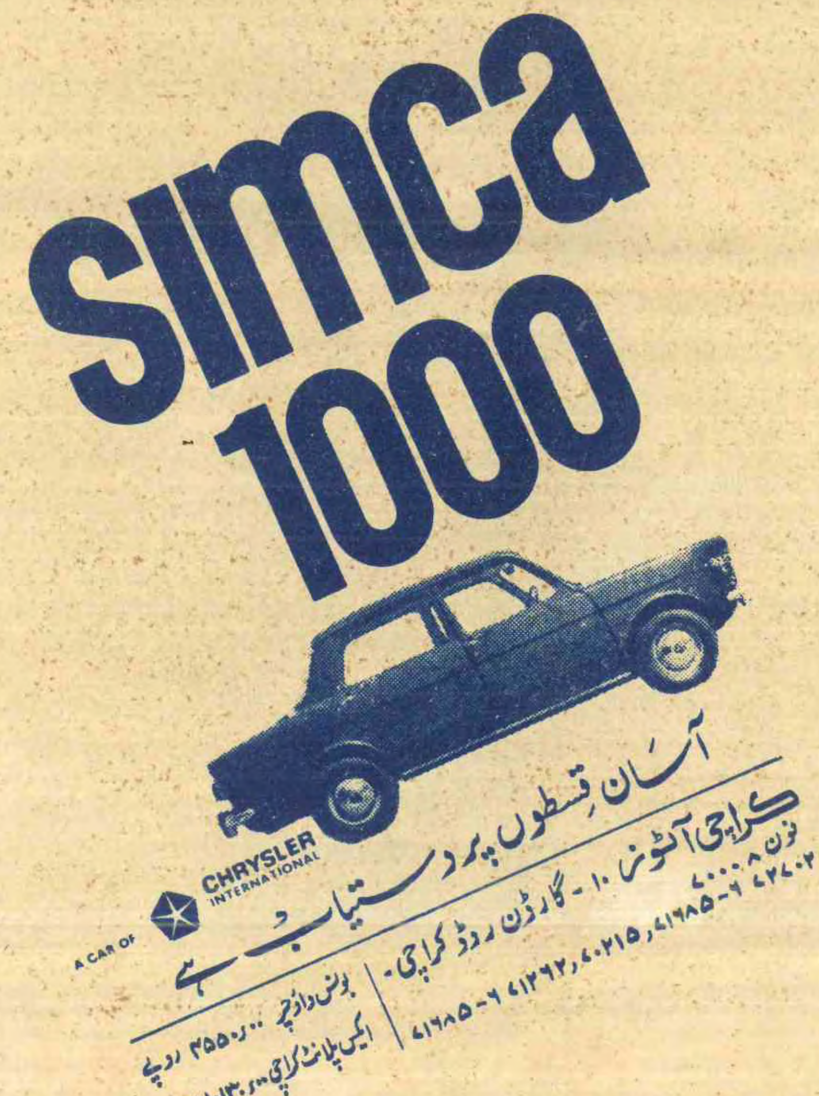
متحرک فلموں کی تاریخ

یہ انیس سو تیس عیسوی کا ابتدائی زمانہ تھا۔ یہ اس برصغیر کی پہلی بولتی فلم تھی۔ "عالم آرا" کی کاسٹ میں مس زبیدہ، ماسٹر وٹھل، زلو بائی، پرتھوی راج جگدیش سیٹھی وغیرہ تھے۔ اس کے عکاس اڈی ایرانی تھے اور اس کے ہدایت کار اور صدا بند اردشیر ایم، ایرانی تھے تمام مشکل مراحل سے گزر کر بالآخر غالباً مارچ ۱۹۳۱ء میں امپیریل فلم کمپنی کی جانب سے سب سے پہلی مرتبہ بمبئی کے میجسٹک سینما میں نمائش کے لئے پیش کی گئی سینما سے کافی فاصلہ تک عوام کا اس قدر ہجوم تھا کہ پولس کنٹرول نہ کر سکی۔ اس زمانے میں درجہ سوئم کا ٹکٹ ۴ آنے تھا جو بلیک میں پانچ اور چھ روپے تک نہ ملتا تھا۔ بہر صورت فلم نے سارے برصغیر میں ہلچل مچادی۔ اسکی کامیابی سے متاثر ہو کر "میڈن تھیٹرز" نے "شیریں فرہاد" بنانے کا ارادہ کیا جس میں "جہاں آرا کجن" اور ماسٹر نثار کو پیش کیا گیا۔ ماسٹر نثار اسٹیج کے شہرت یافتہ اداکار تھے "شیریں فرہاد کی ساری صدا بندی اس زمانے کے مشہور عالم (R.C.A) مشینری پر کی گئی اور" عالم آرا "ٹیز ساؤنڈ سسٹم پر، صدا بندی کی گئی تھی۔ مگر صدا بندی کے عمدہ نتائج (RCA) ساؤنڈ سسٹم پر برآمد ہوئے۔ جسکے باعث تادم تحریر اسکی شہرت میں کمی نہیں ہوئی۔ اس کے بعد میڈن تھیٹرز نے "لیلیٰ مجنوں" "شکنتلا" "اندر سبھا نامی فلمیں تیار کیں۔ جن میں کجن اور ماسٹر نثار، عبدالرحمٰن کابلی مرحوم مرکزی کردار ادا کیا کرتے تھے۔ مندرجہ فلموں میں سے اندر سبھا میں بے انتہا گانے تھے شاید آج تک کسی اور فلم میں اتنے گانے نہ ہونگے۔ اس کے ہر مکالمے اشعار سے ادا کئے گئے تھے جبکہ کم و بیش (۵۹) گانے تھے مگر اس کے باوجود اسکی مقبولیت میں کسی قسم کی کمی نہیں ہوئی۔ ذرا غور فرمایئے آجکل کسی فلم میں صرف ۱۲ گانے دیئے جائیں تو شاید تماش بین سینما چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوں۔

اسکی مقبولیت کی وجہ صرف یہ تھی کہ بولتی فلموں کا بالکل ابتدائی دور تھا۔ ہر فلم بین زیادہ سے زیادہ مکالمے اور گانے سننے کا مشتاق ہوا کرتا تھا۔ اس دور میں صرف عوام کی تفریح مہیا کرنے والی فلمیں بنائی گئیں۔ مثال کے طور پر "انارکلی" "ٹائپسٹ گرل"، سیف سلیمانی۔ گل بکاؤلی۔ بلبل پرستان۔ رتناولی وغیرہ۔ اس دور کے بعد فلمی صنعت میں کچھ بیداری پیدا ہوئی۔ جسکے بعد مار دھاڑ اور دیو مالائی فلمیں پسند کی جانے لگیں جس میں یہودی کی لڑکی، مصر کا خزانہ، جلتی نشانی، پنجاب میل، زمبو، رنگیلا جوان، سلطانہ، کیپٹن کشوری وغیرہ نے کافی شہرت حاصل کی۔ ایک زمانے تک عوام مندرجہ بالا قسم کی فلمیں پسند کرتے تھے بالآخر عوام نے ایسی فلموں سے بیزاری کا اظہار، شروع کر دیا۔ عوام کے رجحانات کو چند بیدار مغز ہدایت کاروں نے فوری طور سے محسوس کر لیا اور سماجی فلمیں بنانے کی داغ بیل ڈالی جنمیں "عورت" "وطن" "روٹی" "ٹھوکر" "باغبان" "ایک ہی راستہ" "بھروسہ" "امرت منتھن" دنیا نہ مانے" "پڑوسی" "ہار جیت" "کپال کنڈلا" "میٹھا زہر" "خان بہادر" "اچھوت کنیا" "چترلیکھا" "مکتی" "جاگیردار" وغیرہ ان فلموں نے اس برصغیر کی فلمی صنعت کا رخ بدل ڈالا اور فلمی صنعت نے ایک نئے انداز سے یہ ثابت کر دیا کہ اچھی اور اچھوتی بامقصد فلمیں عوام میں پسند کی جاتی ہیں ملک میں اس صنعت کی دھاک بیٹھ گئی۔ آئے دن بمبئی میں نئی نئی فلم کمپنیاں قائم ہونا شروع ہو گئیں اور جدید آلات سے مرصع نگار خانے قائم ہونا شروع ہو گئے مثلاً ریجنٹ مووی ٹون — ساگر۔ جیوتی اسٹوڈیو۔ شری ساؤنڈ۔ کاردار اسٹوڈیو، منروا مووی ٹون، بمبئی ٹاکیز، واڈیا مووی ٹون۔ موہن اسٹوڈیو۔ سینٹرل اسٹوڈیو وغیرہ۔ اس کے علاوہ کولہاپور میں بھی اسٹوڈیو قائم ہوئے۔ مگر چند سال بعد آگ لگ جانے کے باعث پونہ میں پربھات اسٹوڈیو کی داغ بیل ڈالی۔ اس کے علاوہ کلکتہ میں نیو تھیٹرز اور میڈن کمپنی نے ملک کے لئے عمدہ تصاویر پیش کیں جنمیں، مکتی، دھوپ چھاؤں، ڈاکٹر، جواب دیوداس، ہمراہی وغیرہ نے کافی مقبولیت حاصل کی، لاہور میں پنجاب آرٹ اسٹوڈیو، پنچولی اسٹوڈیو وغیرہ نے اس زمانے میں بڑی معیاری تصاویر بنائیں جن میں صفدر جنگ" خاندان" خزانچی" پونجی۔ داسی" زمیندار" سسی پنوں" شیریں فرہاد" ہیر سیال جیسی فلمیں بنائیں اس زمانے کی تکنیک اور اس زمانے کی تکنیک میں کافی فرق پیدا ہوا۔ پہلے پہل فلم میں راست گانوں کی صدا بندی کی جاتی تھی۔ اس لئے اس زمانے کی ہیروئن کے لئے اور ہیرو کے لئے گانا جاننا نہایت ضروری تھا۔ اس کے بعد اب اسکی ترقی یافتہ شکل میں پلے بیک کا سلسلہ شروع کیا۔ جسکے بعد ہیروئن اور ہیرو کو گانا جاننا ضروری نہ رہا کسی دوسرے صداکار کی آواز میں دوسرے اداکاروں پر صدا بندی کیجا سکتی ہے۔ اس خصوص میں نیو تھیٹرز اور بمبئی ٹاکیز پیش پیش رہے اس زمانے میں فلم صرف کمپنی کے نام سے شہرت حاصل کیا کرتی تھی عوام کو معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ اس کا ہدایت کار کون ہے اور اس کا موسیقار کون ہے۔ مگر آج عوام فلم کے ہدایتکار سے لے کر ہر کارندے کے نام سے واقفیت رکھتے ہیں۔ ان ہی عوامی ضروریات کے پیش نظر اس لائن اور صنعت میں تعلیم یافتہ اشخاص آنے لگے جسکی وجہ سے اس فلمی صنعت نے ایسی ایسی ترقیاں کیں کہ ساری دنیا متحیر ہو گئی۔ آج کی دنیا کا ہر آدمی اس صنعت سے دلچسپی کا اظہار کرتا ہے۔ دنیا کی ساری تفریحات میں فلم کو ایک نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پہلے پہل ابتدائی دور سے کر وسطی دور تک قدامت پسند اشخاص فلمی صنعت کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھا کرتے تھے۔ مگر آہستہ آہستہ اس طبقہ پر بھی عیاں ہوتا گیا کہ فلمی صنعت ایک" تعلیم یافتہ مزدوروں کی صنعت" ہے۔ جہاں مزدوری اور بے انتہا ایماندارانہ مشقت کے سوا کچھ نہیں۔

پروڈیوسر اور ہدایت کار سے لے کر ایک لائٹ مین تک فلم کے ایسے منظم حیثیت کے مالک ہوتے ہیں کہ ایک دوسرے سے علیحدہ ہو کر کسی بھی صورت سے اس صنعت کو آگے نہیں بڑھا سکتے جس طرح گھڑی کی حالت ہے کہ ایک معمولی سے پرزے کے علیحدہ ہونے سے نہیں چل سکتی اس طرح ایک فلم کا بھی یہی حال ہوا کرتا ہے۔ تجربہ، خلوص، ہم

باقی صفحہ ۴۴ پر


simca
1000
A CAR OF CHRYSLER INTERNATIONAL
آسان قسطوں پر دستیاب ہے
کراچی آٹوز ۱۰ - گارڈن روڈ کراچی -
فون ۷۰۰۰۸ ، ۷۲۷۰۲ ، ۷۱۹۸۵-۶ ، ۷۰۲۱۵ ، ۷۱۲۶۲ ، ۷۱۶۸۵-۶
بونس واؤچر ۳۵۵۰٫۰۰ روپے
ایکس پلانٹ کراچی ۱۰۱۳۰٫۰۰ روپے
noon advertising

REGD.NO. S - 2575

THE MONTHLY MANSHOOR KARACHI

